سالنامہ

فروری ۱۹۶۷

ایجنسی: اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶
ٹیلی فون: ۲۶۱۴۷۰
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس

سال نامہ
کھلونا نئی دہلی
فروری ۱۹۶۷

۲۲۷ واں پرچہ : انیس واں سال
قیمت سال نامہ : ۲ روپے ۵۰ پیسے
سال بھر کی قیمت : ۸ روپے

نگراں :
یوسف دہلوی
مدیر :
الیاس دہلوی
مدیرانِ اعزازی :
یونس دہلوی
ادریس دہلوی

مطبوعہ : انڈین پرنٹنگ ورکس، نئی دہلی   ٹائیٹل کے صفحات : رین بو پرنٹرز دہلی

بے ساختہ ہنسی ـــــ کھی کھی کھی

تصویر: برہم دیو

پتّوں میں چاند

پھولوں میں مُسکان

تصاویر : پرساد

گلی کا آرٹسٹ

اسکول کا آرٹسٹ

تصاویر: ایس نظام

میں سائیکل کیسے چلاؤں

میں تو چلا سکتی ہوں

تصاویر: صدیقی

ننھّی موٹر والی

تصویر: برہم دیو

اپنی باتیں
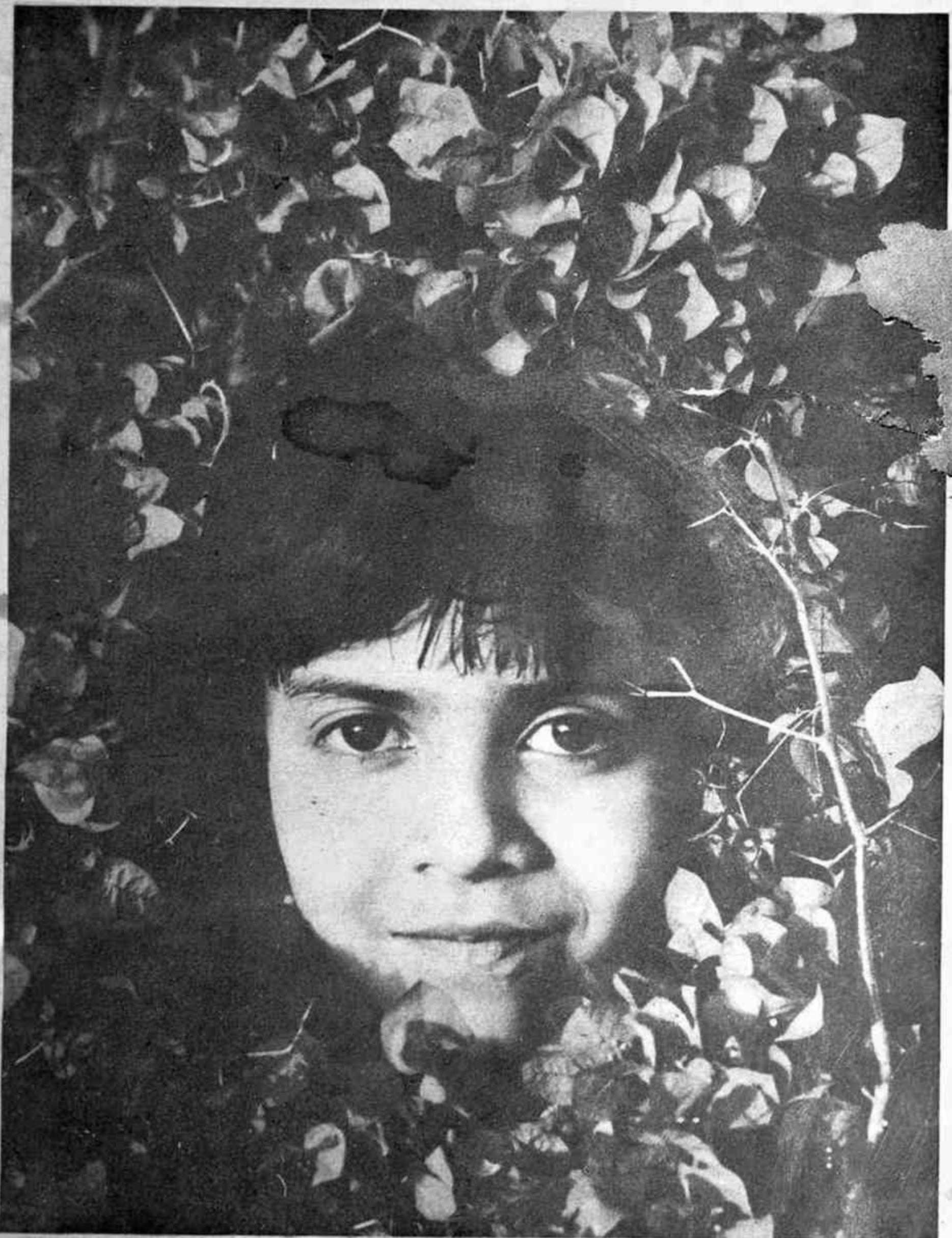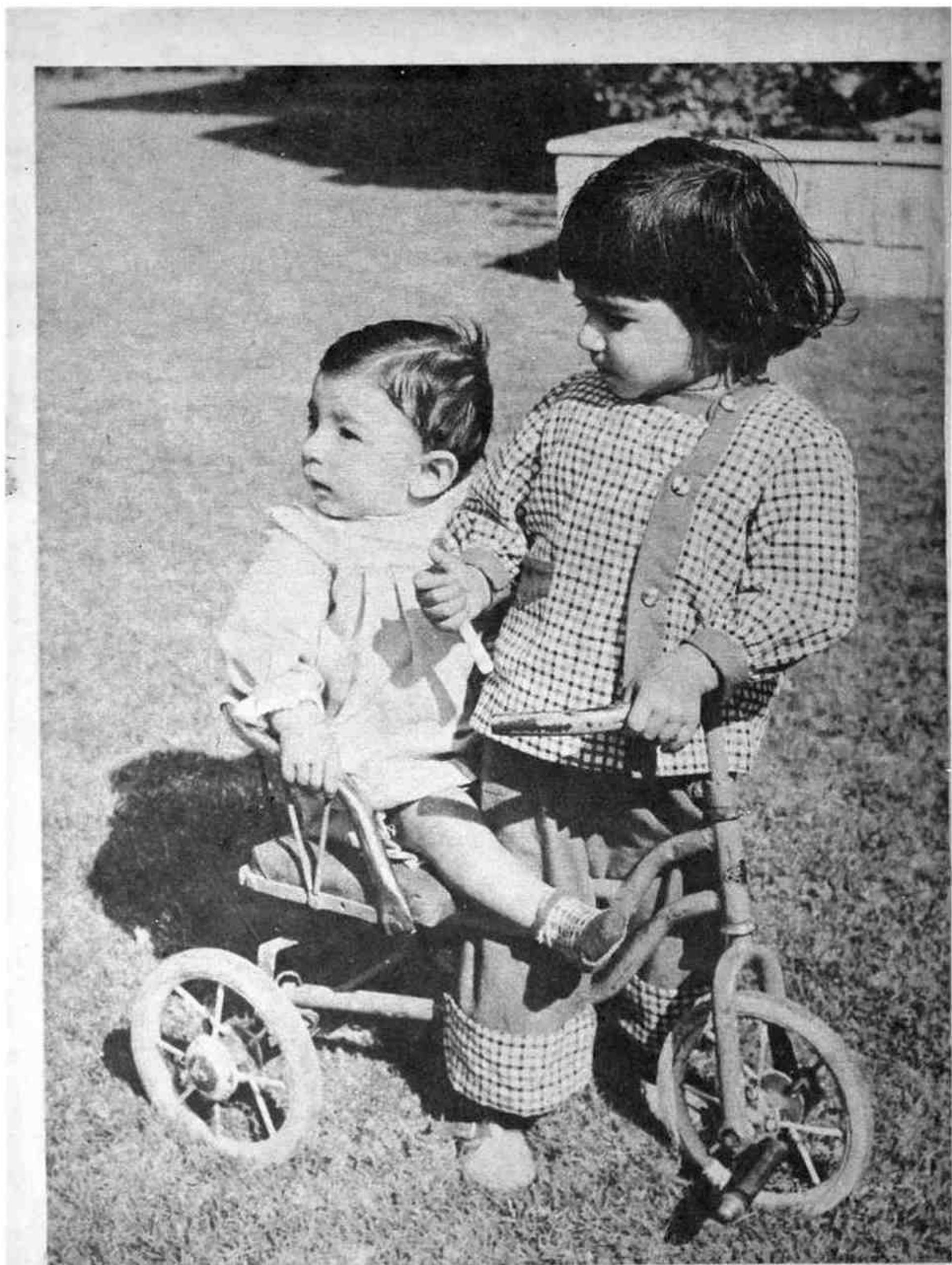
سال نامہ حاضر ہے —— فارسی کا محاورہ ہے: "دیر آید درست آید" یعنی جس کام میں دیر ہوتی ہے وہ درست ہوتا ہے، لیکن سال نامہ ملنے میں جو دیر ہوئی ہے اس کے لئے یہ فارسی محاورہ سُنا کر اپنے لئے کوئی بہانہ تلاش نہیں کیا ہے بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ اعلان تھا کہ سال نامہ جنوری کی ۲۵ تاریخ تک تم کو مِل جائے گا، اسی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے کام زور شور سے شروع ہوگیا۔ مگر کچھ اہلِ قلم بزرگوں نے، کچھ ادیب بھائیوں نے وعدے کے باوجود ہمیں اپنی کہانیاں وقت پر نہیں بھیجیں۔ ایک بار تو ہم نے فیصلہ کرلیا کہ ان کہانیوں کے بغیر ہی سال نامہ پیش کردیں تاکہ آپ کو روز روز ڈاکیہ کا انتظار نہ کرنا پڑے، مگر پھر ہمیں بزرگوں کا قول یاد آیا کہ دیر آید درست آید، اس لئے ہمیں کچھ دن انتظار کرنا پڑا —— سال نامہ تم کو ذرا دیر سے ہی ملا ہے مگر اس پر کتنی محنت کی گئی ہے وہ تم کو اسے دیکھتے ہی معلوم ہوگیا ہوگا۔ اسے ہم نے اپنے پچھلے سب سال ناموں سے زیادہ نِکھار اور سنوار کر پیش کیا ہے۔ یہ اچھّی اچھّی کہانیاں، عمدہ عمدہ نظمیں، دل چسپ مضامین، خوبصورت تصاویر اور مزے دار لطیفوں اور کارٹونوں کا انبار ہے۔ تم کو یہ بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اُردو میں شائع ہونے والے بچّوں کے کسی پرچے میں نہ ایسا اچھا سال نامہ شائع کیا اور نہ کرسکتا ہے۔ اب اِسے پورا پڑھو اور اس کے فوراً بعد ہمیں خط سے اپنی رائے بھیجو۔

اور ہاں —— صفحات کی کمی کی وجہ سے اس مرتبہ "ہمارے نام"، "مسکراہٹیں" اور "تمہارا خط مِلا" شائع نہیں کئے جارہے۔

تمہارا ساتھی:

[signature]

: آصف علی روڈ، نئی دہلی
: ۲۷۲۰۶۷، ۲۷۲۰۶۸
تار کا پتہ : شمع نئی دہلی

سال نامہ
کھلونا نئی دہلی
فروری ۱۹۶۷

۲۲۷ واں پرچہ : انیس واں سال
قیمت سال نامہ : ۲ روپے ۵۰ پیسے
سال بھر کی قیمت : ۸ روپے

مالکان : شمع میگزین طابع و ناشر : یونس دہلوی

ان کے علاوہ :

- ★ انعامی تصویر اور انعامی کارٹون کے نتیجے
- ★ تصویری کہانیاں ★ عجائبات
- ★ بے گنتی کارٹون
- ★ پانچ انعامی مقابلے اور بہت سی دل چسپیاں

ایجنسی: اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

ٹیلی فون: ۲۶۱۳۷۰

دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس

نگراں:
یوسف دہلوی

مدیر:
الیاس دہلوی

مدیرانِ اعزازی:
یونس دہلوی
ادریس دہلوی

مطبوعہ : انڈین پرنٹنگ ورکس، نئی دہلی ٹائیٹل کے صفحات : رین بو پرنٹرز دہلی

بچے کی دعا
ڈاکٹر محمد اقبال
لبؔ پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دُور دُنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مِری پروانے کی صورت یارب
عِلم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبّت کرنا
مِرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس راہ پہ چلانا مجھ کو
JAGDISH PANKAJ
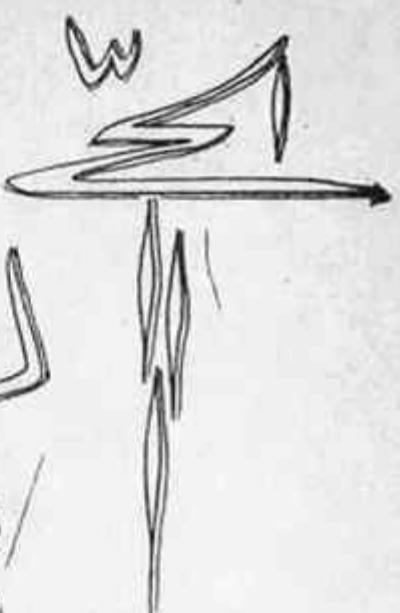
راجہ مہدی علی خاں (مرحوم)

راشدہ باجی اور ایک لڑکی

راشدہ باجی نے چپکے سے منہ پر مرے ایک تھپّڑ جو مارا تو میں ہنس پڑی
دے کے پھر ایک گھونسہ انہوں نے کہا کان کھینچوں تمہارا تو میں ہنس پڑی

سب دلیلیں جو اُن کی تھیں معقول تھیں
اور مجھے پیٹنے میں وہ مشغول تھیں

بھوکی اک بکری چپکے سے جب چر گئی آکے اُن کا غرارہ تو میں ہنس پڑی

اُن کا برقع بندریا کو پہنا دیا
پرس بندر کے ہاتھوں میں پکڑا دیا

جب وہ یہ کہہ کے گھبرا کے رونے لگیں ہائے برقع ہمارا تو میں ہنس پڑی

کھا گئی عید کی وہ سویّاں مری
مجھ سے بولیں کہ کھالے تو یّاں مری

مارے غصّے کے جھٹ آستینوں کو جب بازوؤں سے اتارا تو میں ہنس پڑی

راشدہ باجی سُن لو غازی بھی ہیں
وہ مجاہد بھی ہیں اور غازی بھی ہیں

باندھ کر سر پہ پگّڑ انہوں نے جوں ہی دشمنوں کو پکارا تو میں ہنس پڑی

بھوت محل

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میں گاؤں سے شہر پڑھنے آیا تھا۔

بات یہ تھی کہ گاؤں کا ہر آدمی میری شرارتوں سے پریشان تھا۔ میں تھا بھی عجیب لڑکا، جب تک کوئی بڑی شرارت نہ کرلیتا چین سے نہ بیٹھتا۔ کبھی سکھو دادا کی بیل گاڑی سے بیلوں کو کھول کر رگھوناتھ کاکا کے کھیتوں کی طرف ہانک دیتا اور جامن کے درخت پر بیٹھ کر سکھو دادا کو اِدھر اُدھر بھاگتے، رگھوناتھ کاکا کو ڈنڈا لے کر دوڑتے اور بیلوں کو کھیت برباد کرتے دیکھ کر لطف لیتا۔ کبھی جلبیہ کاکی کی چُٹیا سے مرا ہوا سانپ باندھ دیتا، اور انہیں بدحواس چیختے چلاتے دیکھ کر خوب ہنستا —— میں بھی کتنا عجیب تھا، اب سوچتا ہوں اور اُن باتوں کو یاد کرتا ہوں تو افسوس بھی ہوتا ہے اور بے اختیار ہنس بھی دیتا ہوں۔ یہ اچھی باتیں نہ تھیں، بہت بُری باتیں تھیں۔ چاچا جی بہت سمجھاتے۔ (پتا جی اور ماتا جی کے مرنے کے بعد دراصل چاچا جی نے میری پرورش کی تھی۔) اُن کا حکم ماننا میرا فرض تھا۔ میں بار بار وعدہ بھی کرتا کہ اب شرارتیں نہ کروں گا، لیکن پھر کوئی نہ کوئی شرارت کر بیٹھتا۔ ایسی ایسی شرارتیں کرتا کہ ہر آدمی مجھے بُرا بھلا کہتا۔ میرے اسکول کے ماسٹر جی بھی پریشان رہتے۔ وہ کہتے "تو بھوتوں کا بھوت ہے، شریر کہیں کا!" لیکن میں انہیں بھی نہ بخشتا۔

ایک بار ماسٹر جی بیٹھے اونگھ رہے تھے کہ میں ان کا چشمہ لے بھاگا۔ گھر پہنچا تو دیکھا چاچا جی خراٹے لے رہے ہیں اور اُن کی عینک ٹیبل پر رکھی ہوئی ہے۔ میں نے اُن کی عینک بھی اٹھالی۔ ماسٹر کی عینک چاچا کی بکری کی آنکھوں پر لگا کر دھاگے سے باندھ دی اور ماسٹر جی کی بکری کی آنکھوں پر چاچا جی کی عینک باندھ دی۔ کچھ نہ پوچھئے کیا لطف آیا۔ صبح سے شام تک ایک تماشہ رہا۔ ماسٹر جی کی بکری عینک لگائے اُدھر بھاگ رہی ہے، چاچا جی کی بکری عینک لگائے دوسری طرف دوڑ رہی ہے، پورے گاؤں میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہر آدمی ہنس رہا تھا۔ سیٹھ بھوبو جس کی دال چاول کی دوکان تھی، ہنستے ہنستے نالی میں گر گیا تھا۔ اس موٹے کو گرتے دیکھ کر گاؤں کے بچوں نے اور آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ پھر دونوں بکریاں پکڑی گئیں۔ چاچا جی نے اپنی بکری کی آنکھوں پر لگی ہوئی عینک اپنی آنکھوں پر لگائی تو چیخ پڑے" یہ میری عینک نہیں، بکری کی عینک ہے۔" اور ماسٹر جی نے جب اپنی بکری کی، عینک لگائی تو کانپنے لگے:
"بھوت! بھوت! یہ بھوت کی عینک ہے، اس سے کچھ نظر نہیں آتا۔"

تھوڑی دیر میں معاملہ صاف ہوگیا، ماسٹر جی کی ناک پر اُن کی عینک تھی اور چاچا جی کی آنکھوں پر اُن کی اپنی عینک چمک رہی تھی —— ماسٹر جی نے کہا" تو بھوتوں کا بھوت ہے۔" اور پھر میری خوب پٹائی ہوئی، دونوں نے مجھے جی بھر کر پیٹا، ماسٹر جی مارتے مارتے تھک گئے تو چاچا جی شروع ہو گئے اور چاچا جی تھک گئے تو ماسٹر جی نے

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

ڈنڈا سنبھالا۔ میں تین روز بستر سے اٹھ نہ سکا، اس پٹائی کے بعد لوگوں کو یقین آگیا کہ میری شرارت اب دُم دبا کر بھاگ گئی ہوگی۔ لیکن بستر سے اُٹھتے ہی میں نے ایک مرا ہوا سانپ، وظیفن کاکی کے گھڑے میں ڈال دیا اور گھاٹ کے نزدیک آم کے درخت پر چپکے سے بیٹھ گیا۔ جب وظیفن کاکی پانی بھرنے گھاٹ پر آئیں تو انہوں نے گھڑے میں سانپ کو دیکھا اور گھڑا پھینک، گاؤں کی طرف چیختی ہوئی بھاگیں، میں خوب ہنسا، درخت پر بیٹھا بیٹھا، ہنسی تھی کہ رکتی ہی نہ تھی، یک بیک نیچے دیکھا تو ماسٹر جی کھڑے سر ہلا رہے تھے۔ "بھوتوں کے بھوت"

میں خاموشی سے نیچے اُتر آیا۔ ماسٹر جی مجھے پکڑ کر چاچاجی کے پاس لائے اور تجویز پیش کی کہ مجھے پڑھنے کے لئے شہر بھیج دیا جائے۔ گاؤں والوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور چاچاجی جھٹ مان گئے اور مجھے شہر لے آئے شہر میں چاچاجی پچھمن کاکا سے ملے۔ پچھمن کاکا اپنے ہی گاؤں کے تھے اور شہر کے قریب ایک بڑے پرانے مکان کے چوکی دار تھے۔ میں تو پچھمن کاکا کو دیکھ کر کانپ گیا۔ کیا صورت تھی! لال لال انگاروں جیسی آنکھیں، چہرے پر گہرے زخموں کے نشان، بڑی بڑی مونچھیں، تنی ہوئی بھویں، آواز ایسی کہ ماسٹر جی بھی ڈر جائیں، ایسا لگتا دور

آسمان سے آواز آرہی ہے اور گونج رہی ہے۔ لچھمن کاکا
نے چاچا جی کو اطمینان دلایا کہ وہ فکر نہ کریں، اسکول میں
میرا نام لکھا کر گاؤں چلے جائیں وہ میرے رہنے کا انتظام
کردیں گے۔ چاچا جی نے اسکول میں نام لکھوا دیا، مجھے
بہت کچھ سمجھایا اور لچھمن کاکا کو روپے دے کر گاؤں واپس
چلے گئے۔

لچھمن کاکا جس مکان کے چوکی دار تھے، وہ بہت
بڑا اور پرانا مکان تھا اور بالکل خالی پڑا رہتا تھا۔ شہر
تک آکر جہاں گاؤں کی سڑک ختم ہو جاتی تھی، وہاں یہ
مکان تھا۔

"کتنی بھیانک جگہ ہے،" میں نے شام کو اسکول سے
واپس آکر سوچا بڑی وحشت معلوم ہو رہی تھی، "اتنے بڑے
مکان میں کس طرح رہ سکتا ہوں،" میں سوچ رہا تھا۔ شہر دو
میل دور تھا، اسکول ایک میل شہر کے راستے پر۔ اس مکان
کی تین منزلیں تھیں ——— اور ہر کمرہ بند پڑا تھا۔ شاید اس
مکان میں پہلے بجلی تھی، لیکن اب صرف تار جھول رہے تھے۔ شام
کو اندھیروں نے اسے نگلنا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی ہی
دیر میں پورا مکان اندھیرے میں ڈوب گیا۔ دور شہر کی روشنی
نظر آرہی تھی۔ میں بہت ڈر گیا۔ ساری شرارت بھول گیا۔

"اندر آؤ"، لچھمن کاکا نے کہا۔ مجھے ایسا لگا جیسے
اس بھیانک مکان کے کسی دریچے سے آواز آئی ہو۔ میں
نے اپنی کتابوں کو سنبھالا، بستر اور لالٹین اٹھائی اور کاکا
کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ انہوں نے کمر سے چابیوں کا ایک
گچھا نکالا، بڑے دروازے کا تالا کھولا اور پھر ——— پھر
سناٹے میں ایک بڑی بھیانک آواز گونجی۔ میں جانے
کس خیال میں تھا، کانپ کر رہ گیا، پھر اپنی حماقت پر
ہنسی بھی آئی، بات یہ تھی کہ وہ دروازے کے کھلنے کی
آواز تھی۔

اندر اندھیرا تھا ——— اندھیرا ہی اندھیرا۔

"اندر آؤ"، لچھمن کاکا کی آواز پھر گونجی اور میں ان
کے پیچھے چلنے لگا۔

"کاکا روشنی نہیں ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے
پوچھا ——— میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ بار بار تھوک نگل
رہا تھا۔

"روشنی ———؟" کاکا نے ایک قہقہہ لگایا، پھر
اس طرح چپ ہو گئے جیسے یہ قہقہہ ان کا قہقہہ نہیں تھا، کسی
خبیث روح کی آواز تھی۔

"روشنی ہے ——— ہے ——— ہے" وہ آگے بڑھتے
جا رہے تھے۔ "ہر طرف روشنی ہے ——— یہ اندھیروں کی
روشنی ہے بیٹے،" وہ پھر ہنسے۔

میں کانپ گیا۔ "کہاں پھنس گیا ہوں بھگوان ———
مجھے یہاں سے نکال دے پربھو، اب کبھی شرارت نہیں
کروں گا،" میں دل ہی دل میں بھگوان سے کہہ رہا تھا۔

"یہ بھوت محل ہے ——— بھوت محل ——— یہاں
اندھیروں کا نام روشنی ہے، یہاں بلب جلانے کی اجازت
نہیں ہے ——— آگے بڑھو ——— سنبھل کر آنا، آگے سیڑھیاں
ہیں ——— میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

میں چلتا رہا۔ "موت لائی ہے مجھے یہاں ———" میں
نے سوچا۔

"لالٹین تمہارے پاس ہے؟"

"ہاں کاکا" میں نے فوراً جواب دیا، شاید اس
خیال سے کہ اسے جلانے کی اجازت مل جائے۔

"تیل ہے اس میں!"

"ہاں کاکا۔"

"ٹھیک ہے تم صرف اپنے کمرے میں دو گھنٹے لالٹین جلا سکتے ہو۔ کیا سمجھے؟"

"سمجھ گیا کاکا ـــــ"

"لالٹین کمرے سے باہر نہ نکلے۔ کیا سمجھے؟"

"سمجھ گیا کاکا۔"

"کھانے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلنا ـــــ کھانا آٹھ بجے نیچے کھانا ہوگا، دس بجے تک پڑھ لکھ کر سو جاؤ۔ کیا سمجھے؟"

"سمجھ گیا کاکا۔"

"اس مکان میں بھوت رہتے ہیں، یہ بھوت محل ہے، کیا سمجھے؟"

"سمجھ گیا ـــ کا ـــ کا ـــــ" میری آواز جانے کہاں سے آ رہی تھی۔

ہم اوپر تیسری منزل پر آ گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا ہر طرف اندھیرا تھا۔ چوہے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا، جیسے بھوت دوڑ رہے ہیں۔

"کاکا۔" میں نے کہا، میری آواز کانپ رہی تھی۔

"جلد کہو ـــــ" کاکا نے چیخ کر کہا۔

"میں آپ کے ساتھ نیچے ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں!" آواز گونج گئی۔ "سب کمرے بند ہیں ـــ سب کمرے بند ہیں۔ میرے مالک کا سامان ہر کمرے میں ہے تم صرف اِس کمرے میں رہ سکتے ہو۔" کاکا نے ایک کمرے کو کھولتے ہوئے کہا۔ چرچراہٹ کی آواز ہوئی اور پورے مکان میں یہ آواز گونج گئی۔

"یہ ہے تمہارا کمرہ، اسی میں رہنا، دوسرے کمروں کی طرف نہ جانا، بھوت مار ڈالیں گے، کیا سمجھے؟"

کاؤنٹ جوزف ۱۷ سال کی عمر میں اٹلی کے ایک فوجی کالج میں حساب کا پروفیسر تھا۔

"سمجھ ـــ گیا ـــ کا ـــ کا۔" میں دل ہی دل میں رو رہا تھا۔

کمرے میں ہر طرف اندھیرا تھا۔

"لالٹین جلالو۔ سامان ٹھیک کر لو۔ پھر لالٹین بجھا دو ـــ نیچے آ جاؤ۔ کھانا کھا کر اوپر آؤ۔ پھر لالٹین جلاؤ۔ دس بجے تک پڑھو۔ جب اِس محل کا گھڑیال دس بجائے تو لالٹین فوراً بجھا دو اور سو جاؤ ـــ بھوتوں کے آنے کا وقت وہی ہوتا ہے۔ چُپ چاپ سو جاؤ ـــ بھول کر باہر نہ نکلو ـــ بستر سے اُٹھے تو پھر ـــ اس محل میں رات بھر بھوتوں کا راج رہتا ہے۔ کیا سمجھے؟"

"سب سمجھ گیا کاکا، سب سمجھ گیا، ایسا ہی کروں گا۔ کاکا۔" میں سمجھ چکا تھا کہ موت مجھے گاؤں سے کھینچ کر یہاں لائی ہے۔

کاکا نیچے چلے گئے۔ میں نے لالٹین جلائی، دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اپنی تمام شرارتیں بھول کر دیر تک سسکتا رہا "یہ کہاں پھنس گیا ہوں۔" کمرے میں ہر طرف مکڑی کے جالے تھے۔ کھڑکی کے شیشے سے گاؤں جانے والی سڑک صاف دکھائی دے رہی تھی ـــ میں سڑک کو تکتا رہا

جی، آپریشن کا سامان تو سب ٹھیک ہے، لیکن ایک کمپاؤنڈر کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔

جیسے وہ سڑک نہ ہو، میرا پیارا گاؤں ہو ـــــ ہائے میرا گاؤں، چھٹ گیا تھا۔

میں نے ٹوٹی ہوئی چارپائی پر اپنا بستر ڈال دیا۔ بستہ میں میری چھوٹی سی ٹارچ بھی تھی جو زمیں دار صاحب کے بیٹے نے بہت دن ہوتے مجھے دی تھی، میں نے اُسے جلا کر دیکھا، کافی روشنی تھی۔ میں نے جھٹ اُسے بجھا کر سرہانے چھپا دیا۔ اگر کاکا نے دیکھ لیا تو وہ اسے ضرور چھین لیں گے۔ وہ تو روشنی سے نفرت کرتے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی ایک میز پر میں نے کتابیں اور کاپیاں ڈال دیں۔ میں نے دیکھا کہ میرے کمرے کے برابر میں ایک دوسرا کمرہ بھی ہے جس میں ایک بڑا سا تالا لگا ہوا ہے۔ تالا زنگ آلود تھا۔

"جانے کب سے بند ہے یہ کمرہ": میں نے سوچا اور اُٹھ کر اُس کمرے کے دروازے تک آیا اور ایک سوراخ سے اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ لہٰذا واپس آ گیا۔

جب آٹھ کا گھنٹہ بجا تو میں نے لالٹین بجھا دی، دروازے میں تالا لگا کر اندھیرے میں ٹٹولتا ٹٹولتا نیچے آیا۔ کاکا انتظار کر رہے تھے، میں نے ان کے ساتھ کھانا کھایا

جب چلنے لگا تو کاکا نے پوچھا "کیا سمجھے؟"

"سب سمجھ گیا کاکا۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ اور اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا تیری منزل پر آ گیا، دروازہ کھولا اور اندر سے بند کر لیا۔ لالٹین جلائی اور بستر پر بیٹھ کر ایک کتاب پڑھنے لگا۔ دل اور دماغ دونوں قابو میں نہ تھے، مجھ سے کچھ پڑھا نہ گیا۔ دس کا گھنٹہ بجا تو میں نے فوراً لالٹین بجھا دی اور چادر لپیٹ کر خاموش لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تھا، لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ عجیب بے چینی سی تھی۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے سیڑھیوں سے چڑھتا ہوا کوئی اوپر آیا ہے۔ اور میرے دروازے کے پاس تھوڑی دیر کھڑا رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ چھمن کاکا ہوں گے! شاید یہ دیکھنے آئے ہوں کہ میں نے اُن کی ہدایتوں پر عمل کیا ہے یا نہیں۔ وہ کاکا ہی تھے۔ انہوں نے آہستہ سے آواز دی "تو سو گیا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری خاموشی سے انہیں یقین آ گیا کہ میں سو گیا ہوں اور وہ نیچے چلے گئے۔

گیارہ کا گھنٹہ بجا ـــــ پھر بارہ کا اور پھر ایک کا گھنٹہ بجا۔

مجھے نیند نہیں آئی، میں چُپ چاپ بستر پر پڑا رہا ہر طرف سنّاٹا تھا، خاموشی تھی۔ صرف چوہے کبھی کبھی اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں کے بعد پاس کے کمرے میں ایک آواز گونجی، جیسے جھٹکے سے کسی نے لوہے کا دروازہ کھولا ہو۔ میں نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ یہ آواز اُسی کمرے سے آئی ہے جس میں بڑا سا پرانا زنگ آلود تالا بند ہے اور جس میں میں نے جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ میں دَم سادھے پڑا رہا۔ میں نے سوچا شاید بھوت آ گئے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اُسی کمرے میں بھاری جوتوں کے ساتھ چلنے اور گفتگو کرنے کی آواز سنائی دی۔ جیسے دو آدمی باتیں کر رہے ہوں۔

میرے کان کھڑے ہو گئے، لیکن کچھ سُن نہ سکا، پھر ایسا لگا، جیسے بڑے بڑے ٹرنک کھولے اور اِدھر سے اُدھر رکھے جا رہے ہیں۔

"بھوت جوتے پہنتے ہیں؟" میں سوچ رہا تھا۔ رات بھر اسی طرح کی آوازیں سُنائی دیتی رہی ہوں گی، اس لئے کہ جب تک میں جاگا ہوا تھا، یہ آوازیں سُن رہا تھا، مجھے یاد ہے میں تین کا گھنٹہ سُن کر سویا تھا۔ صبح اُس وقت جاگا جب پھمن کاکا نے زور زور سے دروازہ پیٹا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ فوراً اندر آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے کمرے کا ایک جائزہ لیا پاس والے کمرے کی طرف بھی دیکھا، میرے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی اور پھر جب اطمینان ہو گیا کہ سب کچھ ٹھیک ہے، تو انہوں نے اطمینان کی ایک سانس لی۔

"نیند خوب آئی کاکا، کھانا کھاتے ہی سو گیا، اور اب جاگا ہوں" میں نے کہا۔

پھمن کاکا کی مونچھیں پھڑکنے لگیں۔ میں ان کے ساتھ نیچے آیا، ہاتھ مونہہ دھویا، کھانا کھایا اور پھر اوپر آ کر کپڑے بدل کر کتابیں سنبھالیں، اپنے کمرے کو تالا لگایا اور اسکول کی طرف بھاگا۔ دن بھر اسکول میں رات کی باتیں یاد آتی رہیں شام کو واپس آیا تو کاکا کو انتظار کرتے ہوئے پایا، اسی طرح رات کو آٹھ بجے کھانا کھایا، کچھ دیر اسکول کا کام کرتا رہا، دس بجے لالٹین بجھا کر، چادر لپیٹ کر چپ چاپ لیٹ گیا۔ اس طرح جیسے میں آدمی نہیں، مشین تھا ——— کاکا کے اشاروں پر چلنے والی مشین۔ کاکا اسی طرح آتے، دروازے پر دستک دی، مجھے پکارا، میں نے انہیں جواب نہیں دیا تو وہ مطمئن ہو کر نیچے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد میں چپکے سے اٹھا، بستر کے نیچے سے ٹارچ نکالی اور کوٹ کی جیب سے ہتھوڑا، جسے اسکول سے

تم نے واقعی ٹھیک کہا تھا اس جنگل کے مچھر اس طرح کاٹتے ہیں جیسے تیر چبھ جاتے

واپس آتے ہوتے خرید لایا تھا، اور پھر پاس والے کمرے کے تالے کو دیکھنے لگا۔

"بہت پُرانا ہے ——— ایک ہی چوٹ میں ٹوٹ جائے گا" میں نے سوچا۔ اور ایک ضرب لگائی۔ تالا ٹوٹ گیا، سناٹے میں آواز گونج گئی۔ فوراً ہی محسوس ہوا کہ کوئی تیزی سے اوپر چڑھ رہا ہے۔ میں خاموش دُبک کر بیٹھ گیا ——— وہ پھمن کاکا تھے۔ شاید دوسری منزل کو دیکھ کر تیسری منزل میں آئے تھے۔ کچھ دیر وہ اِدھر اُدھر گھومتے رہے، میرے دروازے پر بھی رُکے اور پھر نیچے چلے گئے۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ نیچے چلے گئے ہیں تو میں نے آہستہ سے اُس کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

میں نے ٹارچ سے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک کونے میں نظر پڑتے ہی میری روح کانپ گئی، وہاں ایک مُردے کا ڈھانچہ کھڑا ہوا تھا۔ جلد ہی میں نے اپنے اوپر قابو پالیا۔ اس ڈھانچے کے قریب گیا، اُسے چھوا تو پورا ڈھانچہ مجھ پہ آ رہا۔ میری تو بس جان ہی نکل گئی، خود کو سنبھالنے میں کتنے لمحے گزر گئے۔ آخر اٹھا اور ٹارچ کی روشنی میں پورا کمرہ دیکھنے لگا۔ وہاں بڑے بڑے صندوق پڑے تھے۔ میں نے

گھبراؤ نہیں گھبراؤ نہیں میں ابھی کوئی سپیرا بلا کر لاتا ہوں

ایک صندوق کو کھولا۔ دیکھ کر گھبرا گیا، دوسرا کھولا، حیرت سے آنکھیں کھُلی رہ گئیں۔ تیسرا کھولا تو آنکھیں ملنے لگا۔ یہ سوچ کر شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ بہت سے صندوق بند تھے۔

گیارہ کا گھنٹہ بجا اور پھر بارہ کا ـــــ مجھے کل کا وقت یاد تھا۔ بھُوت ایک بجے کے بعد آتے تھے۔ میں اطمینان سے تمام چیزیں دیکھتا رہا۔ یک بیک مجھے یاد آیا کہ میں نے دروازہ کھُلا چھوڑ دیا ہے، لپک کر آگے بڑھنا چاہا تو لوہے کی ایک موٹی کڑی میں میرا ایک جوتا پھنس گیا اور میں گر گیا، میں اٹھا اور اُس کڑی کو ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ لوہے کی ایک ـــــ مضبوط کڑی تھی۔ سیمنٹ اور اینٹ کی زمین پر لوہے کا ایک تختہ تھا اور اسی تختے میں وہ کڑی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اٹھ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور پھر لوہے کے تختے کو کچھ دیر دیکھتا رہا۔ میں نے کڑی کو پکڑ کر کھینچا تو پورا تختہ اٹھ گیا۔ پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے دیکھا میرے سامنے نیچے کی طرف جانے والا ایک لمبا سا زینہ تھا۔

"یہ تہہ خانہ ہے" میں نے سوچا اور ٹارچ کی روشنی میں نیچے اُتر گیا۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو ایک تاریک گلی شروع ہو گئی، چاروں طرف سے بند ـــــ میں تیز تیز دوڑنے لگا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد سامنے روشنی نظر آئی، میں نے ٹارچ بجھا دی، اور روشنی کی طرف بڑھتا رہا، جلد ہی اس روشنی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ روشنی ایک خیمے سے آرہی تھی۔

اب میں ایک بڑے میدان میں تھا۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے، میدان کے چاروں طرف چھوٹی بڑی پہاڑیاں تھیں۔ میں نے فوراً محسوس کر لیا کہ میں تہہ خانے سے نکل کر بڑی نالیوں جیسی راہوں سے گزر کر شہر سے باہر آگیا ہوں۔ میں چپکے سے خیمے کے پیچھے آگیا، خیمے کے اندر کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا، چند ہی لمحوں بعد خیمے کے قریب ایک بڑا ٹرک آکر رُکا۔ خیمے سے چار آدمی نکلے اور تاریکی میں ٹرک سے سامان اُتارنے لگے۔ ٹرک پھر واپس چلا گیا۔ میں نے خیمے میں جھانک کر دیکھا، بڑے بڑے صندوق کھولے جا رہے تھے اور اُن میں سے ـــــ لیکن ایک دم میں نے سوچا کہ یہاں بیٹھے رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لہٰذا آہستہ سے نکل بھاگا اور پھر ان ہی راستوں سے ہوتا ہوا کمرے میں آگیا، اور لوہے کے تختے سے راستہ بند کر دیا تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ پر تھیں، صرف مردے کا ڈھانچہ ٹوٹ گیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ میری سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ تالے اور ڈھانچے کے ٹوٹ جانے کا مجھے افسوس تھا۔ جانے کیا ہو ـــ کاکا نے دیکھ لیا تو یقیناً جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

رات کے دو بجے کے بعد اسی کمرے میں دو آدمیوں کی سرگوشیاں سنائی دیں۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے اور اِسی طرح سامان اٹھا کر اِدھر اُدھر رکھ رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد ہر طرف خاموشی تھی، شاید وہ دونوں واپس چلے گئے تھے۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا تو میں سو گیا۔

صبح کو بہت سویرے نیند ٹوٹ گئی۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ کاکا کے آنے سے پہلے ہی نیچے چلا جاؤں، وہ آ گئے اور اُن کی نظر دوسرے کمرے کے تالے پر پڑ گئی تو مصیبت آ جائے گی۔

میں نے دروازہ کھولا تو کانپ کر رہ گیا ــــ پھمن کاکا سامنے کھڑے تھے ــــ لال لال آنکھیں، پھڑکتی ہوئی مونچھیں زخموں کے گہرے نشان ــــ میں نے اُن کے اندر آتے ہی تیزی سے دروازہ بند کر دیا اور کہا "آئیے کاکا، آج میں سویرے اُٹھ گیا۔"

پھمن کاکا کچھ سوچتے ہوئے میرے ساتھ نیچے آئے۔

"رات بھوتوں نے شور تو نہیں کیا؟" انہوں نے یک بیک پوچھا۔

"رات ..... رات ..... وہ ..... وہ میں تو سو گیا تھا، ہاں کبھی کبھی نیند میں ایسا لگ رہا تھا کہ دوسرے کمرے میں ....."

"دوسرے کمرے میں ــــ!" وہ جیسے چیخ پڑے۔ میری آواز بند ہو گئی۔

"..... ہاں ایسا لگا شاید دوسرے یا تیسرے کمرے میں بھوت دوڑ رہے ہیں۔" میں نے کسی طرح کہا۔

"دیکھا تو نہیں کچھ؟" کاکا کی آنکھیں اور سُرخ ہو گئی تھیں۔

"کچھ نہیں کاکا۔ کچھ بھی نہیں۔ بھلا بھوتوں کو کون دیکھ سکتا ہے کاکا؟ میں نے سوچا، بھوت ہیں، صبح تک چلے جائیں گے۔ بھلا مجھے کیا تکلیف ہے اِن سے؟ میں تو خوب سویا، سچ پوچھو تو کاکا، گاؤں میں مجھے راتوں کو نیند ہی نہیں آتی تھی، جب سے یہاں آیا ہوں، خوب سو رہا ہوں۔

پھمن کاکا کو اطمینان ہو گیا۔ میں نے مونہہ ہاتھ دھو کر

ڈاکٹر صاحب ــــ اسے نزلہ بھی ہے اور کھانسی بھی

کھانا کھایا، اوپر آیا، ایک بار پھر ٹوٹے ہوئے تالے کو دیکھا اور کانپ کر رہ گیا۔ کپڑے بدل کر بستر اٹھایا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے اسکول کی طرف بھاگا۔

کاکا باہر اپنے کمرے میں لیٹ گئے تھے۔"

اسکول پہنچتے ہی ماسٹر صاحب نے مجھے ڈانٹا، اس لئے کہ میں نے اُن کا کام نہیں کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بنچ پر کھڑا کر دیا، اور کہا کہ کان پکڑ کر کھڑے رہو۔ میں کھڑا رہا، جب گھنٹہ ختم ہو گیا تو ماسٹر صاحب مجھے گھورتے ہوئے باہر نکلے۔ میں اُن کے پیچھے دوڑا اور کہا "میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ آئیے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟ یہی نا کہ رات سر میں درد تھا، اس لئے کام نہ کر سکا۔" ماسٹر صاحب گرجے۔

"نہیں سَر، ایک عجیب بات ہے، بہت ہی عجیب بات ہے سَر۔" میں نے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" ماسٹر صاحب مجھے اسکول کے کنویں کے قریب لے گئے اور پوچھنے لگے "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے رات کا سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ ماسٹر صاحب کو

پہلے تو یقین نہ آیا۔ وہ بار بار یہی کہتے رہے "تم نے خواب دیکھا ہے۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ جھوٹ بولنے کی تمہیں سخت سزا ملے گی"۔ میں اپنی بات پر اَڑا رہا۔ پھر انہیں کچھ یقین سا آگیا۔ تھوڑی دیر وہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کرتے رہے اور مجھے لے کر پولیس اسٹیشن آئے۔ وہاں انہوں نے انسپکٹر صاحب سے کچھ باتیں کیں اور مجھ سے کہا "سچ سچ بتاؤ کیا دیکھا ہے؟ اگر جھوٹ کہا تو جیل بھیج دئے جاؤ گے"۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا، سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ پھر مجھے اسکول بھیج دیا گیا۔

شام کو جب میں اپنے وقت پر بھوت محل واپس ہوا۔ تو دیکھا لچھمن کاکا کے کمرے میں بہت سے پولیس والے بیٹھے ہیں انسپکٹر صاحب اور ماسٹر صاحب بھی وہاں موجود تھے۔

"تم آگئے، تمہارا ہی انتظار تھا"۔ ماسٹر صاحب نے محبت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ انسپکٹر صاحب کے حکم سے لچھمن کاکا کے مونہہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ اور اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ دئے گئے تھے اور ایک کمرے میں انہیں بند کر دیا گیا تھا۔ دو سپاہی دروازے پر کھڑے تھے ــــ میں انسپکٹر صاحب، ماسٹر صاحب اور کچھ سپاہیوں کو لے کر اوپر آیا ــــ انسپکٹر صاحب نے ہر چیز کا معائنہ کیا۔ پھر وہ تہہ خانہ کھولا گیا۔ سپاہی بندوقیں سنبھالے، انسپکٹر صاحب ریوالور اور ٹارچ لئے اور میں اور ماسٹر صاحب ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے نیچے اُتر آئے اور خیمے کی طرف بڑھنے لگے۔

ایک گھنٹے کے بعد سب واپس آئے۔

ہمارے ساتھ چار بھوت تھے ــــ خوفناک چہروں اور بھیانک آنکھوں والے بھوت۔

جب کاکا اور اُن چاروں بھوتوں کو پولیس والے لے جا رہے تھے اور اُن کے ساتھ کمرے کا سارا سامان جا رہا تھا تو میں نے لچھمن کاکا سے کہا "کاکا، مجھے اکیلے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ اِس بھوت محل میں مجھے بھوتوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کیا سمجھے؟"

سب ہنسنے لگے۔

"سب سے بڑا بھوت تو تمہارا لچھمن کاکا ہی ہے۔ اسے ایسی سزا ملے گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ انسپکٹر صاحب نے کہا۔

اُسی شام ماسٹر صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پھر میں ماسٹر صاحب کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ سرکار نے مجھے سونے کا ایک تمغہ انعام میں دیا، ہر طرف میری تعریفیں ہو رہی تھیں ــــ اخباروں میں میرا نام چھپ رہا تھا۔

گاؤں سے بوڑھے ماسٹر جی اور چاچا آئے۔ ماسٹر جی نے پوچھا "آخر اُن صندوقوں میں تھا کیا؟"

میں نے کہا "ماسٹر جی اُن میں دوسرے ملکوں کے قیمتی جواہرات تھے، سونے کی اینٹیں تھیں، قیمتی انگریزی دوائیں تھیں کتنی ہزار خوب صورت چھوٹی بڑی گھڑیاں تھیں۔ یہ سب اسمگلر تھے ماسٹر جی، وطن کے دشمن، وطن کو بدنام کرنے والے"۔

ماسٹر جی حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے، اُن کے مونہہ سے بے اختیار نکلا "تو بھوتوں کا بھوت ہے، شریر کہیں کا۔ یہ بھی تیری شرارت ہے"۔

اب میں بہت بڑا ہو گیا ہوں۔ پرانی باتیں یاد آ رہی ہیں گاؤں جاتے ہوئے اُس بھوت محل کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ بھوت محل اب ایک بڑا شاندار ہوٹل بن گیا ہے۔

میں جانتا ہوں، گاؤں میں مجھے دیکھتے ہی میرے نہایت بوڑھے ماسٹر جی جن کے مونہہ میں اب شاید ایک دانت بھی نہ ہوگا، آہستہ سے کہیں گے "تو آگیا! تو بھوتوں کا بھوت اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ یہ بھی تیری شرارت ہے"۔ ●●

شراری لڑکے اور قوالی

حسرت جے پوری

اپنے ٹیچر کو نچائیں تو مزا آجائے
اُن کی عینک کو چرائیں تو مزا آجائے
اُن کے ڈنڈے کو چھپائیں تو مزا آجائے
آج جی بھر کے ستائیں تو مزا آجائے

کون سا دن ہے جو ٹیچر نے نہیں مارا ہے
ہم نے ہر کام کیا پھر بھی تو پھٹکارا ہے
اُن کا غصہ ہے کہ دہکا ہوا انگارا ہے
آگ میں آگ لگائیں تو مزا آجائے

مُنہ پہ چانٹے بھی دیئے! ہم کو بنایا مُرغا
ہم نے اسکول سے ہر روز یہ تمغہ پایا
کتنے جلاد ہیں ٹیچر ارے اللہ اللہ
ہم بھی مُنہ اُن کا چڑائیں تو مزا آجائے

وہ پڑھاتے ہیں تو اوسان خطا ہوتے ہیں
حق پڑھائی کے بہ دشوار ادا ہوتے ہیں
ہم اگر روتے ہیں پھر اور خفا ہوتے ہیں
آج اُن کو بھی رُلائیں تو مزا آجائے

اُن کی کُرسی پہ چلو آؤ پٹاخے باندھیں
جب وہ آئیں تو پٹاخوں کا تڑپنا دیکھیں
ہم بھی شاگرد ستم گار ہیں اتنا مانیں
پیچھے پیچھے ہی بھگائیں تو مزا آجائے

اُن کی جو چیز ہے چُپکے سے چھُپا دیں آؤ
پان بیڑی کی جو ڈبیا ہے اُڑا دیں آؤ
ہم شرارت کے نئے جال بچھا دیں آؤ
وہ کبھی جال میں آئیں تو مزا آجائے

وہ اگر سامنے آجائیں تو مِل کر چیخیں
وہ کہیں! چُپ رہو ہم اور بھی ہنس کر چیخیں
اور وہ آنکھیں دکھائیں تو اکڑ کر چیخیں
اُن کو دیوانہ بنائیں تو مزا آجائے

کھلونا

بلونت سنگھ

بچو، تم نے فرضی کہانیاں تو بہت سی پڑھی ہوں گی لیکن میں آج ایک سچا واقعہ پیش کرتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے فرضی کہانی لکھنی ہی نہیں آتی، لیکن میں نے سوچا کہ ہر وقت گپ ہانکنا بھی اچھا نہیں، کبھی کبھی سچ بھی بولنا چاہئے۔

یہ واقعہ اُس زمانے کا ہے جب میں بھی تمہاری طرح بچہ تھا ـــــ بچہ کیا، اچھا خاصہ لڑکا تھا۔ اُن دنوں میں دہرہ دون میں رہتا تھا۔ یہ واقعہ وہیں پیش آیا تھا۔

آج کا دہرہ دون میرے دہرہ دون سے بہت کچھ بدل چکا ہے۔ بندال ندی کے اُس پار جو چائے کا باغ تھا، وہ اب نہیں رہا۔ شہر سے نکل کر بندال ندی کا پُل پار کرنے پر ایک سڑک داہنی طرف اور دوسری بائیں طرف جاتی نظر آتی تھی۔ یہ دو سڑکیں اب بھی موجود ہیں، لیکن اب یہ آباد ہو گئی ہیں۔ ان کے دونوں طرف مکانات بن گئے ہیں۔ اُن دنوں بائیں ہاتھ والی سڑک بہت سنسان رہا کرتی تھی۔ وہ چائے کے باغ میں سے گزرتی تھی۔ رات کے وقت اس کے دونوں طرف جنگلی جانوروں کی بھیانک آوازیں سنائی دیا کرتی تھیں۔

ایک شام کو میں اپنے شہر کے مکان میں بیٹھا ایک

دوست ہربنس سنگھ کے ساتھ گپ ہانک رہا تھا۔ میری والدہ صاحبہ
پرنس آف ویلز کالج میں ایک سہیلی کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ وہ
مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ شام تک میں بھی وہیں پہنچ جاؤں، کیوں کہ
رات وہیں گزارنے کا ارادہ تھا۔

اُن دنوں یہ کالج چائے کے باغ کے اُس پار تھا۔
اب یہ سینک اسکول کہلاتا ہے۔ گپوں میں اتنا مزا آرہا تھا کہ میرے
دوست نے کہا، "ابھی رُکے رہو۔ پھر میں سائیکل پر تمہیں وہاں
تک چھوڑ آؤں گا۔"

اس طرح باتوں ہی باتوں میں نو بج گئے۔ سردیوں
کا موسم تھا، رات کا وقت۔ میں نے سوچا کہ والدہ صاحبہ بہت
پریشان ہو رہی ہوں گی۔ خیر ہم دونوں کی سواری روانہ ہوئی۔ ہربنس
سائیکل چلا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے کیریر پر بیٹھا تھا۔ ہربنس کے
ہاتھ میں ٹارچ تھی اور میرے ہاتھ میں چار فٹ لمبا ڈنڈا تھا۔ ہم
نے ضرورت سے زیادہ بہادری سے کام لیتے ہوئے مختصر راستے
سے جانے کی ٹھانی جو چائے کے باغ میں سے ہو کر گزرتا تھا۔

ان سڑکوں پر بھیڑیئے، بھالو، گیدڑ اکثر دکھائی دے
جاتے تھے۔ قریب کی چھاؤنی میں ایک بار ایک شیر آگھسا تھا۔
ان سب باتوں کا علم ہوتے ہوئے بھی ہم اس جنگل میں گھس پڑے۔
ہم پتلی سی پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔ ہمارے داہنے ہاتھ پر ایک
برساتی نالہ تھا جو ان دنوں سوکھا پڑا تھا۔

ایک موڑ سے گھومتے وقت اچانک ہمیں ڈراؤنی چنگھاڑ
سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ ہم سمجھ پاتے کہ حقیقت کیا ہے۔ ہمارے
بائیں پہلو والے پیڑ پر زوردار سرسراہٹ ہوئی اور پھر کسی جانور نے
شاید پیڑ ہی کے اوپر سے ہم پر چھلانگ لگا دی۔

سائیکل لڑکھڑا کر تین فٹ نیچے نالے میں جا گری اور
اس کے ساتھ ہم بھی لڑھک گئے۔ نہ ڈنڈے کی خبر رہی، نہ ٹارچ
کی۔ دھندلکے میں ہمیں تیزی سے حرکت کرتی ہوئی ایک پرچھائیں
سی دکھائی دی۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ اس جانور نے مجھ پر
حملہ بول دیا۔ میں گھبرا کر جلدی سے پیچھے ہٹا، پھر بھی اس کے ناخن
میرے کوٹ کے کالر میں پھنس گئے۔ نہ جانے لمحہ بھر بعد کیا ہوتا اگر
میرا ساتھی اس کی دُم نہ پکڑ لیتا۔

یوں تو مجھے بھی کسرت کا بہت شوق تھا، لیکن ہربنس
مجھ سے زیادہ طاقت ور اور دلیر تھا۔ وہ جانور کی دُم کو دونوں
ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے پاؤں پر گھومتا اور اُسے گھماتا ہوا پرے
لے گیا۔ پھر دُم اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ جانور اس کی طرف
لپکا۔ ہربنس نے مدد کے لئے مجھے پکارا۔ اسی اثنا میں ڈنڈا میرے
ہاتھ میں آگیا۔ میں نے پوری طاقت سے ڈنڈا جانور کو پھینک کر مارا۔
نشانہ سر کا باندھا تھا، لیکن لگا اس کی پچھلی ٹانگوں پر۔ اس چوٹ
سے وہ کچھ کم زور پڑ گیا۔ اس نے غرّا کر میرا رُخ کیا۔ مزے کی بات
یہ تھی کہ ہم میں جس پر حملہ ہوتا وہ کچھ نہ کر پاتا

اب ہربنس نے ڈنڈا سنبھالا اور اس سے پہلے کہ جانور
جست لگاتا، اس نے ڈنڈے کی ضرب اس کے سر پر لگائی۔ جانور
حواس باختہ ہوگیا۔ اب کیا تھا، ہربنس نے پے در پے ڈنڈے
کے وار کئے ـــــ یہاں تک کہ جانور مر گیا۔

جانور کے مرجانے کے بعد ہی ہمیں اس بات کا احساس
ہوا کہ ہماری جانیں بچ گئی ہیں۔ تلاش کے بعد ٹارچ ملی تو اس کی
روشنی میں پتہ چلا کہ وہ جانور دراصل چیتا تھا۔ وہ یا تو چھوٹی قسم کا
چیتا تھا، یا کم عمر تھا، ورنہ اگر بڑا چیتا ہوتا تو ہم دونوں کا کام یقیناً
تمام کر دیتا۔

ہم چیتے کو سائیکل پر لاد کر منزل تک پہنچے جہاں چیتا
بھنگیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ میرا دوست واپس شہر چلا آیا۔

اب بھی جب اس بھیانک رات کا خیال آتا ہے تو بدن
کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

●●

قتیل شفائی

پیار کی جنّت

ماں کی گود اور باپ کا سایا
پیار کی جنّت بن کر آیا

آنکھ کھلی جس دن ہم نے کھولی — جھولا بنی تھی ماں کی جھولی
پیار سے ہم کو چُوم رہا تھا — باپ کا دل بھی جھوم رہا تھا
ہم روتے تو اس نے ہنسایا
ماں کی گود اور باپ کا سایا
پیار کی جنّت بن کر آیا

ہم نہ کسی سے بھی ڈرتے تھے — روز نئی اِک ضد کرتے تھے
امّی چاند کی سیر کرا دو — ابّا ہمیں جہاز منگا دو
جو کچھ مانگا ہم نے پایا
ماں کی گود اور باپ کا سایا
پیار کی جنّت بن کر آیا

ماں کے پیار کو بھول نہ جانا — باپ کے دل کو تم نہ دکھانا
دُور ہیں اُن کی شفقت سے جو — کتنے بڑے بدقسمت ہیں وہ
ان کو نہیں معلوم خدایا
ماں کی گود اور باپ کا سایا
پیار کی جنّت بن کر آیا

دُنیا کے عجیب وغریب جانور
مے چگن (امریکہ) کا یہ طوطا اس وقت تک کوئی چیز نہ کھاتا تھا۔ جب تک کوئی انسان اُسے چکھ نہ لیتا
برلن میں ایک شخص نے خرگوش کی ایک نئی نسل ایجاد کی ہے ۔ اس خرگوش کا وزن ۱۶ پونڈ سے زائد ہوتا ہے ۔
افریقہ میں اوکاپی نام کا جانور پایا جاتا ہے جس کے پیر زیبرا کے ہوتے ہیں، سر زراف کا سا، گردن گھوڑے کی سی، جسم گدھے کا سا اور دُم بیل کی سی۔
چین کے عجائب گھروں میں اب بھی ایک ہرن پایا جاتا ہے جس کے پیر گائے کے، گردن اونٹ کی اور دم خچر کی ہوتی ہے
مصری بکروں کے کان گدھے کے کان سے زیادہ لمبے ہوتے ہیں
افریقہ میں ایک ایسا چوہا پایا جاتا ہے جو اپنی تمام عمر آنکھیں نہیں بند کرتا۔
البرٹ نام کی ایک چڑیا کے سر پر دو سینگیں ہوتی ہیں جو اس کے بدن کی لمبائی سے تگنی لمبی ہوتی ہیں
مراقش کے کاشت کار ہل میں گدھے اور اونٹ کو ایک ساتھ جوتتے ہیں
بحر روم میں پائلٹ نام کی ایک مچھلی پائی جاتی ہے جو سینکڑوں میل تک جہاز کا تعاقب کرتی رہتی ہے

م ۔ م ۔ راجندر

صبح کا بھولا

خالد میاں مشکل سے سولہ سال کے ہوں گے کہ لگا اُن پر زمانے کا رنگ چڑھنے۔ گورے چٹے تو ماشاء اللہ تھے ہی، مگر لمبے اور پتلے بھی تھے۔ آنکھوں میں سرمہ لگا لیتے تو لڑکیوں کی طرح حسین لگتے۔ کبھی کبھی چہرے پر پاؤڈر کا بھی استعمال کر لیتے۔ مگر گھر والوں کو گھبراہٹ تو اس وقت ہوئی جب بمبئی سے چچا جان کے اُن کے لئے بھیجے ہوئے پتلون کے لئے ٹیریلین کے ایک ٹکڑے کی انھوں نے اپنے "جیب خرچ" سے پتلون سلوالی! یہ بالکل نئے فیشن کی "پنسل پتلون" تھی۔ ٹانگوں کی نیلیاں رانوں پر سے بھی نہ ہی ذرا اور اُوپر سے تو موٹی ہوتی ہیں، لیکن خالد میاں نے اُن کی گنجائش بھی نہیں رکھوائی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب پتلون انھوں نے درزی کے یہاں سے لاکر پہنی تو آدھ گھنٹہ تو انھیں اندر غسل خانے میں اُسے پہننے میں ہی لگ گیا اور پھر جو پہن کر باہر نکلے تو بس یہ سمجھ لیجئے کہ ٹانگوں کو اوپر تک جیسے کسی نے کالے چمکیلے کپڑے سے منڈھ دیا تھا۔ ابا تو خیر بچوں کے معاملے میں یوں بھی کم بولتے تھے۔ مگر امی، آپا اور ارشد بھائی جان نے انھیں جو دیکھا تو دانتوں میں انگلی دبا کر رہ گئے۔ تبسم آپا کی تو ہنسی چھوٹ گئی وہ آگے بڑھ کر بولیں "اُف توبہ! خالد یہ کیا تماشہ بنوایا ہے۔ اتنی تنگ پتلون!"

"آپا جان" خالد میاں تنک کر بولے "آپ تو جو بیس گھنٹے گھر میں رہتی ہیں باہر نکلیں تو آپ کو آج کل کے فیشن اور رواج کا پتہ لگے۔ میں نے ہی نہیں کئی لڑکوں نے ایسی ہی پتلون سلوائی ہے۔"

آپ بلا وجہ مجھے کیوں بکار رہے ہیں ڈاکٹر نے کہا ہے آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔

"چل ہٹ" ارشد بولا۔ "بڑا آیا ہے فیشن ایبل سارا کپڑا خراب کرالیا۔"

خالد میاں چپ ہوگئے مگر دل ہی دل میں تبسّم آیا پر جھنجلا رہے تھے انھوں نے کنگھا شیشہ اٹھایا اور بالوں کو کنگھے سے موڑ کر کوئی دس منٹ کی محنت سے اس طور پر بنایا جیسے کسی چبوترے کی سیڑھیاں ہوں اور ان میں سے ہی ایک لٹ نکال کر ماتھے پر گرالی۔ پھر اپنے کالے بوٹ نکالے، جن کی نوک بنانے والے نے سوئی کی نوک جتنا باریک بنانے میں اپنی سی پوری کوشش کر ڈالی تھی۔ اُنھیں پہنا اور اکڑ کر باہر نکل گئے۔

اس خاندان میں اتنا فیشن آج تک کسی نے نہ کیا تھا۔ یوں بھی فیشن ایبل تو ارشد کو ہونا چاہیے تھا جو کالج میں بی۔اے میں پڑھتا تھا اور جہاں ایک سے ایک لڑکا نت نئے فیشن کر کے آتا تھا۔ مگر ارشد اپنی پڑھائی کی طرف زیادہ دھیان دیتا تھا۔ عام طور پر کالج اچکن اور پاجامے میں جاتا۔ سوٹ ایک نہیں دو تھے۔ لیکن ڈھنگ کے۔ خالد میاں کو جو یہ پر لگنے لگے تھے تو کوئی آٹھ نو مہینے سے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ منالال کی صحبت میں پڑ گئے تھے۔ منالال بابو کالی چرن کا بگڑا ہوا لڑکا تھا اور ان ہی کی کلاس میں پڑھتا تھا۔ گھر والوں نے کئی دفعہ منع کیا کہ منالال کے ساتھ نہ پھرا کرو بلکہ محلے میں جو دوسرے اچھے بچے تھے، گورو دیو سنگھ، ریاض اور سریندر وغیرہ ان کے ساتھ اٹھا بیٹھا کرو، مگر خالد میاں منالال سے بڑے مرعوب تھے اور اس کی دوستی نہ چھوڑ سکے۔ نویں کلاس میں ہی کیا، سکول بھر میں کوئی فیشن اتنا نہ کرتا جتنا منالال، عجیب وغریب رنگ اور نقشوں کی بش شرٹیں پہن کر آتا اور طرح طرح کے بال بناتا۔ جس طرح کی تپلون وہ پہنتا شاید سرکس کے جوکر بھی نہ پہنتے ہوں، کئی دفعہ ماسٹر صاحبان نے ٹوکا بھی مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ پچھلے سال وہ فیل ہوگیا تھا اور اس سال بھی اس کا فیل ہونا یقینی تھا وہ سب لڑکوں کو چھیڑتا پھرتا اور بات بات پر اُن سے لڑائی لڑتا۔ ڈیل ڈول کا چونکہ اچھا تھا اس لئے لڑکے بھی اس سے ٹکّر لیتے ہوئے ڈرتے تھے اپنے فیشن اور بالوں کے ڈیزائن کی وجہ سے اُس نے خود ہی اپنا دوسرا نام "دلیپ کمار" رکھ لیا تھا اور لڑکے اب اُسے اُسی نام سے پکارتے تھے۔ خالد میاں کو منالال کی ان خوبیوں نے کھینچ لیا تھا اور وہ اُسی کی صحبت میں رہنے لگے تھے اور اسی کے طور طریقے سیکھ رہے تھے۔ پڑھائی میں وہ پہلے ہوشیار تھے، مگر جب سے دھیان اور باتوں کی طرف ہوا تھا، پڑھائی میں بھی کمزور ہوگئے تھے۔ منالال نے ان کا نام بھی سکول میں "شہزادہ" رکھ دیا تھا اور خالد میاں اس خطاب کو پاکر بے حد خوش ہوتے۔

منالال میں اور بھی کئی عیب تھے وہ سگریٹ پیتا تھا اور گھر سے پیسے چرا کر کباڑی محلے کے ایک دو آوارہ لڑکوں کے ساتھ جن سے اس کا میل جول تھا، تاش کا جوا کھیلتا تھا۔ کبھی وہ ایک آدھ روپیہ ہار جاتا اور کبھی جیت لیتا۔ تمام لڑکوں پر اس کی امیری کا رعب تھا۔

خالد میاں نے جو ایسی تپلون سلوائی، اس میں بھی منالال ہی کا ہاتھ تھا۔ اسی نے درزی کو ایڑی سے لے کر کمر تک یہ بتادیا تھا کہ کون سی جگہ کتنے انچ ہو۔ چونکہ خالد میاں منالال کے جگری دوست تھے اور منالال درزی کا دوست تھا اس لئے درزی نے اس دوستی کے رشتے سے ٹیرلین کی اس تپلون کی سلائی پندرہ روپے کی بجائے صرف دس روپے لینا منظور کرلی تھی اور جب درزی نے یہ احسان

ان دونوں پر رکھا تھا تو بلاشبہ اُس کی نظر اس آدھے میٹر کپڑے
پر بھی تھی جو اس قسم کی پتلون سلوائے جانے پر اُسے صاف بچے رہا تھا
چونکہ خالد میاں یہ نئے فیشن کی پتلون سلوا رہے تھے جس کے لئے
گھر والے کبھی راضی نہ ہوتے اس لئے انھوں نے سلائی اپنے
"جیب خرچ" سے دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ مگر جیب خرچ کے تو ان کے
پاس صرف تین روپے تھے۔ چنانچہ ایک ایک کرکے تین موقعوں پر
اُنھوں نے تین روپے ابا کی جیب سے چرا لئے اور چار روپے
منالال نے "اُدھار" دئے۔

اس طرح منالال کی صحبت میں خالد میاں نہ صرف اپنی پڑھائی
ہی کھو بیٹھے بلکہ چوری کرنا اور اُدھار لینا بھی سیکھ گئے۔ ایک روز
منالال نے اُن سے کہا "شہزادے کسی طرح پانچ روپے کرلے دیوالی
والے روز فلاش ہوگا۔ تو بھی چلنا پچیس تیس روپے بنا لائیں گے۔"

"مجھے تو فلاش نہیں آتا" خالد میاں بولے۔

"ابھی تو کئی دن باقی ہیں میں سکھادوں گا۔ کچھ نہیں تین پتّوں
کا کھیل ہے چھوٹے بڑے کی بات ہے۔ حوصلہ اور ہوشیاری کی
ضرورت ہے اور میں بھی تو تیرے ساتھ ہوں گا۔ میرا تیرا آدھا ساجھا
رہے گا تجھے کیا فکر ہے!"

"مگر پیسوں کا کیسے ہوگا؟ جیب خرچ تو پہلی کو ملے گا۔"

"ایسا کر" منالال اُنھیں سمجھانے لگا "اگر گھر میں ادھر اُدھر
پڑے ہوں تو کھسکالے۔ ورنہ میں بتاؤں اپنی دو تین کتابیں بیچ دے
پھر خرید لیں گے۔ میں بھی یہی کر رہا ہوں۔"

خالد میاں بہکانے میں آگئے۔ محمد شکور کتب فروش خالد کے ابا
کو جانتا تھا۔ خالد نے اپنی کتابیں منالال کو دے دیں اور وہ بیچ آیا۔ مگر
محمد شکور نے خالد میاں کو بھی دیکھ لیا تھا جو دکان سے کچھ دور کھڑے
ہو گئے تھے۔

دیوالی والے روز خالد میاں یہ کہہ کر اسکول میں کھیل ہو رہے

....اور پھر جج صاحب پستول اتفاق سے اپنے آپ ہی چل گیا۔ بس بالکل اس طرح۔

ہیں، گھر سے کھسک گئے اور منالال انھیں اپنے ساتھ کباڑی محلے
میں لے گیا۔ خالد میاں فلاش سیکھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ منالال
ساتھ تھا اور اُنھیں یقین تھا کہ اگر وہ نہیں تو منالال پیسے ضرور بنالے گا
خالد میاں پہلی مرتبہ اس اڈے پر آئے تھے۔ وہ منالال کے جوئے
کے ساتھیوں کو دیکھ کر کچھ ڈرے بھی کیونکہ یہ لڑکے عمر میں تو شاید
ان کے ہی برابر تھے، مگر اپنے حلیوں اور وضع قطع سے گرہ کٹ
لفنگے اور اُچکے معلوم ہوتے تھے۔ سب لڑکے سگریٹ پی رہے تھے
اور تاش پھینٹ رہے تھے۔

کھیل شروع ہوا۔ خالد اور منالال ایک آدھ بازی ہی جیتے
ہوں گے، باقی ہار ہی رہے تھے۔ ان کے پاس پتّے آتے بھی تو ان
سے کوئی نہ لڑتا اور سب پتّے پھینک دیتے۔ منالال اپنی قسمت
پر جھنجلا رہا تھا۔ مگر بات دراصل یہ تھی کہ منالال کے یہ ساتھی عیاری
چوری اور لفنگے پن میں بڑوں کے بھی کان کاٹتے تھے۔ انھوں نے
آج یہ "شکار" پھنسائے تھے اور چاروں طرف اپنے لڑکے بٹھا دئے
تھے جو شوقیہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے کے پتّے دیکھ لیتے تھے۔ کیونکہ
وہ خود تو کھیل نہیں رہے تھے۔ ان لڑکوں سے پتّوں کے اشارے
پہلے ہی سے طے ہو گئے تھے۔ وہ پتّے دیکھتے اور ایک دوسرے

کو اشارہ کر دیتے کہ کس کے پاس کس قسم کے پتے ہیں ۔ دو ایسے ہی لڑکے خالد اور منالال کے پتے بھی دیکھ رہے تھے ۔ ان بےچاروں کو شک بھی نہ ہوا کہ یہ معاملہ ہے ۔ اس لئے ہار کے باوجود انھوں نے پیچھے چھپانے کی کوشش نہیں کی ۔ پھر سب کے ہی پتے اس طرح کے بیٹھے ہوئے "تماشائی" دیکھ رہے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی گھنٹہ بھر میں ہی منالال اور خالدمیاں پندرہ روپے ہار گئے ۔ خالد کوئی چھ روپے اور منالال کوئی نو روپے ۔

خالدمیاں اس ہار کے بعد باہر نکلے تو بازاروں میں دیوالی کی بھیڑ بھاڑ اور رونق کے باوجود انھیں ہر چیز اُجاڑ اُجاڑ ، اُداس اُداس نظر آئی ۔ اُنھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی بڑا جرم ، بڑا گناہ کر کے نکلے تھے جو خاندانی شرافت سے بہت بعید تھے اب وہ حساب جیومٹری ، الجبرے ، انگریزی اور تاریخ کی کتابیں کیسے واپس لیں گے ؟ پڑھائی کا کیا ہوگا ؟ اُف انھوں نے یہ کیا کیا تھا ؟ وہ منالال سے بات کئے بغیر گھر کی طرف آہستہ آہستہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ بڑھے ۔

اُدھر محمد شکور خالدمیاں کی کتابیں لے کر گھر پہنچ گیا اور ان کی امّی کو بتانے لگا ، خالد کی یہ کتابیں منالال بیچ گیا تھا ۔ میں نے بعد میں دیکھیں ۔ مگر چونکہ خالد بھی کچھ ہی فاصلے پر کھڑا تھا اس لئے میرے خیال میں اس نے ہی منا کے ہاتھ یہ کتابیں بکوائی ہوں گی ۔

محمد شکور کے آنے سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے ایک لڑکا جسے منالال نے پیٹا تھا یہ خبر بھی دے گیا تھا ۔ خالد منالال کے ساتھ جوا کھیلنے لگا ہے ۔ خالدمیاں کے ابا یوں تو اپنی اولاد پر جان چھڑکتے تھے اور عموماً معمولی غلطیوں کو نظر انداز کر جاتے تھے ۔ مگر جب انھوں نے خالد میاں کی ان کرتوتوں کو سنا تو ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ۔ وہ چھڑی ہاتھ میں لے کر آنے دو آج اس بدذات کو " امّی اور ارشد بھیّا ابا کے غصّے سے واقف تھے ۔ وہ ذرا اِدھر اُدھر ہوئے تو انھوں نے چھڑی چھپادی ۔

خالدمیاں چھپتے چھپاتے گھر میں داخل ہوئے تو اس سے پہلے کہ ابا کی نظر اُن پر پڑتی ، ارشد اُنھیں جلدی سے امّی کے کمرے میں لے گیا اور ارشد ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ خالدمیاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور رُندھے ہوئے گلے سے بولے " امّی بھیّا ، آپا سب مجھے معاف کر دیجئے ۔ میں نے بُری صحبت میں پڑ کر کئی بُرے کام کئے ۔ میں نے گھر سے پیسے چرائے ، کتابیں بیچیں اور جوا کھیلا ۔ آج میں نے توبہ کر لی ہے کہ کبھی بُرا کام نہیں کروں گا ۔ اچھے لڑکوں سے دوستی رکھوں گا اور پڑھائی کی طرف دھیان دوں گا ۔ خدا کے لئے مجھے معاف کرا دیجئے ۔ "

ارشد نے خالدمیاں کا سر اٹھایا تو اُن کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا ۔ اُس نے کہا " خالد یہ سچی توبہ ہے یا صرف آج بچنے کا بہانہ ہے ؟ "

" میں سچ کہتا ہوں بھیا میں اب ایک نیک لڑکا بن جاؤں گا " خالدمیاں نے کہا ۔

" اگر یہ بات ہے خالد تو بھول جاؤ ہر بات کو نئی زندگی شروع کرو اور تمھیں ہمارا سب کا پیار ملے گا ۔ اب امّی جان آپ ابا کو سمجھا کر اسے بخشوا دیں ۔ "

" ہم نے معاف کر دیا " پیچھے سے ابا کی آواز آئی " ہم نے سب کچھ سن لیا ہے خالدمیاں کے چہرے پر صاف شرمندگی کے اور پچھتاوے کے آنسو ہیں ۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اُسے بھولا نہیں سمجھتے ۔ "

امی نے آگے بڑھ کر خالدمیاں کو گلے سے لگا لیا اور خالد پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ۔ مگر اب ابا اور ارشد ، اور آپا ہنس پڑے ۔ ابا نے کہا " چلو اب اس سے کہو ، مونہہ ہاتھ دھوئے کئی دفعہ اسے گورودیو سنگھ اور مہندر بلانے چلے ہیں ۔ بھئی آج دیوالی ہے سارا محلے میں خوب رونق رہے گی ۔ عید ہو ، دیوالی ہو بچے تو سب دیوانے ہو جاتے ہیں ۔ "

●●

عجیب تصویر

آرٹسٹ نے تمھارا "امتحان" لینے کے لئے یہ تصویر غلط بنائی ہے۔ اس تصویر کو غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ اس میں کتنی غلطیاں ہیں؟ اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر "عجیب تصویر" ماہ نامہ کھلونا آصف علی روڈ نئی دہلی نمبر ۱ کے پتے پر بھیج دو۔ ۲۵ فروری تک ملنے والے جوابوں میں جو جواب صحیح ہوں گے ان میں سے دس بہن بھائیوں کو ایک ایک روپیہ انعام دیا جائے گا۔

عجیب تصویر۔ ماہ نامہ کھلونا آصف علی روڈ۔ نئی دہلی نمبر ۱

کتاب	مصنف	قیمت
ایران کی شہزادی	عادل رشید	پینتیس نئے پیسے
اندھا شہزادہ	سعید لدھیانوی	پینتیس نئے پیسے
اڑتا پہاڑ	عشرت رحمانی	چوالیس نئے پیسے
انوکھا مقدمہ	رازداں ایم اے	چوالیس نئے پیسے
آخری خواہش	عادل رشید	پینتیس نئے پیسے
آخری شرارت	سراج انور	پینتیس نئے پیسے
اندھا جادوگر	مسعود جہاں	پینتیس نئے پیسے
بے وقوفوں کی کہانیاں	کرشن چندر	پینتیس نئے پیسے
بادشاہ کا انعام	ادریس دہلوی	پینتیس نئے پیسے
بے وقوف بادشاہ	سعید الدین پرنجہ	پینتیس نئے پیسے
بندروں کا تھیٹر	سیفی سیوہاروی، خدیجہ سیفی	چالیس نئے پیسے
برف کا آدمی	مسعود جہاں	پینتیس نئے پیسے
بونوں کی دنیا	سعید لدھیانوی	پینتیس نئے پیسے
بھوتوں کا خزانہ	سراج انور	پینسٹھ نئے پیسے
بوڑھا بھوت	عشرت رحمانی	چالیس نئے پیسے
پاگل ڈاکٹر	افتخار احمد اقبال	پینتیس نئے پیسے
پرستان کی شہزادی	راجہ مہدی علی خاں	پینتیس نئے پیسے
پری کا تحفہ	راجہ مہدی علی خاں	چوالیس نئے پیسے
تین ہیرے	سلام مچھلی شہری	چوالیس نئے پیسے
تیسری آنکھ	شوکت تھانوی	پینتیس نئے پیسے
جادو کا گلاب	زکی انور	پینتالیس نئے پیسے
جادو کا ہار	عادل رشید	چالیس نئے پیسے
جادو کا دروازہ	سراج انور	پچاس نئے پیسے
چڑیا گھر	پرکاش پنڈت	چوالیس نئے پیسے
چوہوں کی حکومت	عادل رشید	چالیس نئے پیسے
چاند کی چوری	پرکاش پنڈت	پینتیس نئے پیسے
چین کی شہزادی	عادل رشید	پینتیس نئے پیسے
چوری کا ہار	اظہر افسر	پینتیس نئے پیسے
چاند کی دلہن	لطفی رضوانی	چالیس نئے پیسے
چینی بلبل	نریش کمار شاد	پینتیس نئے پیسے
چاند کی سیر	پرکاش پنڈت	پینتیس نئے پیسے
چار بہنیں	سیفی سیوہاروی، خدیجہ سیفی	پینتالیس نئے پیسے
چور شہزادی	سیفی سیوہاروی، خدیجہ سیفی	پینتیس نئے پیسے
چندا ماموں	سعید اللطیف پرنجہ	پینتیس نئے پیسے
خونی دروازہ	افتخار احمد اقبال	پینتیس نئے پیسے
خون کا دریا	سراج انور	چالیس نئے پیسے
خونی ڈاکو	عادل رشید	چوالیس نئے پیسے
دو کام چور	سیفی سیوہاروی، خدیجہ سیفی	پینتیس نئے پیسے
سونے کی بکری	راجہ مہدی علی خاں	چالیس نئے پیسے
سونے کا سیب	کرشن چندر	چالیس نئے پیسے
سمندر کی شہزادی	نریش کمار شاد	چوالیس نئے پیسے
سرکس کے کھیل	پرکاش پنڈت	چوالیس نئے پیسے
سونے کی صندوقچی	کرشن چندر	پینتالیس نئے پیسے
شاہی نجومی	راجہ مہدی علی خاں	چالیس نئے پیسے
شیطان کا تحفہ	کرشن چندر	پینتیس نئے پیسے
شیر کی بیٹی	داستان گو	چوالیس نئے پیسے
شہزادے کو پھانسی	وحشی مارہروی	پینتالیس نئے پیسے
شریر لڑکا	سیفی سیوہاروی، خدیجہ سیفی	پچپن نئے پیسے
غریب شہزادی	مسعود جہاں	پینتیس نئے پیسے
کامیابی کی راہیں	حامد اللہ افسر (حصہ اول دوم)	ایک روپیہ
کالا چور	اظہر افسر	پینتیس نئے پیسے
کالا مونہہ	شوکت تھانوی	چالیس نئے پیسے
گھسیٹا کی بھتنا شاہی	سیفی سیوہاروی	پینسٹھ نئے پیسے
گم شدہ خزانہ	سیفی سیوہاروی، اکبر سیفی	پینتیس نئے پیسے
لنگڑی کتاب	راجہ مہدی علی خاں	پینتیس نئے پیسے
موٹر نمبر ۷۸۶	راجہ مہدی علی خاں	چالیس نئے پیسے
مانو کے کارنامے	عشرت رحمانی	پینسٹھ نئے پیسے
نیلی کھوپڑی	شکیل الرحمان	پینتیس نئے پیسے
نرالا جانور	پرکاش پنڈت	اکتالیس نئے پیسے
نیلی جادوگرنی	راجہ مہدی علی خاں	پینتیس نئے پیسے
ہلال کی کہانیاں	عشرت رحمانی	پینتیس نئے پیسے
ہیروں کا سوداگر	عشرت رحمانی	چالیس نئے پیسے
جادو کی بنسری	امین شرخیری	پینتالیس نئے پیسے
خوفناک جزیرہ	سراج انور	پانچ روپے
ستاروں کے قیدی	ظفر پیامی	دو روپے
چڑیوں کی الف لیلیٰ (مکمل چار حصے)	کرشن چندر	تین روپے

کھلونا بک ڈپو — آصف علی روڈ — اجمیری گیٹ — نئی دہلی

صبح کی ورزش

شفیع الدین نیّر ایم اے

صبح سویرے تڑکے تڑکے
چلتے چلتے باغ میں آئے
اُچھلے کُودے دوڑے بھاگے
خوش ہو ہو کر شور مچایا
اُٹھے بیٹھے اور ڈنڑ پیلے
اِس ورزش سے پھُرتی آئی
جب تن میں یوں چستی جاگی

گھر سے چلے اسکول کے لڑکے
باغ میں آکر کھیل جمائے
دوڑے بھاگے پیچھے آگے
جوش کبڈّی کا دِکھلایا
سب لڑکے مِل جُل کر کھیلے
دوڑنے بدن میں گرمی لائی
پاس سے اُن کے سُستی بھاگی

صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں
وہ سبزہ وہ نہر وہ پانی
وہ سورج کی کرنیں پیاری
چشمے اور چلتے فوّارے
دیکھ کے اُن کو جان سی آئی

پھولوں کی رنگین قبائیں
پانی کی دلکش وہ روانی
جِن پر جی اور جان ہو واری
پیارے پیارے سے نظّارے
آنکھوں نے بھی ٹھنڈک پائی

ورزش کر کے دِل بہلا کر
سب کے سب اسکول میں آئے
لِکھنے بیٹھے پڑھنے بیٹھے
سیر نے اُن کا کام بنایا

گھر آکر کچھ کھانا کھا کر
خوشیوں سے چہرے چمکائے
کل سے آگے بڑھنے بیٹھے
پڑھنا خوب سمجھ میں آیا

جو بھی سویرے اُٹھ جاتے ہیں
دِن بھر خوب مگن رہتے ہیں
کھانے میں ہیں لذّت پاتے
ذہن بھی پاتا اُن کا جِلا ہے

ورزش بھی کچھ کر پاتے ہیں
بن کر اُن کے بدن رہتے ہیں
پڑھنے میں ہیں لُطف اُٹھاتے
روح بھی پاتی اُن کی ضیا ہے

صبح کو اُٹھنا سیر کو جانا
ورزش کرنا جی بہلانا
ہے نیّر یہ عادت اچھی
بنتی ہے اِس سے صحت اچھی

دُنیا میں ایسے بھی بادشاہ گزرے ہیں

انگلینڈ کا شاہ ہنری دوئم اتنا منتشر دماغ رہتا تھا کہ وہ ہمیشہ کھڑے ہو کر کھانا کھاتا تھا۔

ریاست کچھ کا راجہ دیسلجی جب ۱۹ سال کی عمر میں ۱۸۳۴ء میں تخت پر بیٹھا تو اس نے سرخ ریشم کی ایک بہت بڑی پگڑی بطور تاج باندھی تھی، اس پگڑی میں جو ہیرے لگائے گئے تھے ان کا وزن ۲۵ پونڈ تھا۔

تیرہویں صدی عیسوی میں جرمنی کا حکمراں شاہ روپرچ سوئم دس سال تک بادشاہت کرنے کے بعد اتنی غربت میں مرا کہ اس نے اپنی وصیت میں یہ لکھا تھا کہ میرا شاہی تاج بیچ کر میرا قرض ادا کر دیا جائے۔

اسپین کے شاہ فلپ کی عادت تھی کہ وہ جاڑے میں صرف ایک کمبل اوڑھ کر اور کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول کر سوتا تھا اور گرمی میں بارہ کمبل اوڑھ کر اور تمام کھڑکیاں بند کر کے سوتا تھا۔

"بوویریا" یورپ کا شاہ میکسملن دوئم اپنی تمام عمر کبھی نہیں ہنسا اس کی موت ۵۳ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔

جھوٹا سچ

جیلانی بانو

یہ میرے بچپن کی بات ہے۔

ابا ہمیں ـــــ یعنی مجھے اور جمال کو بچوں کی ایک رنگین فلم "پل اینڈ کو" دکھانے لے گئے تھے۔ جب ہم بس میں سوار ہوئے تو ہماری نظریں ایک لڑکی پہ جم گئیں جو ہماری ہی عمر کی ہوگی۔ وہ بے حد خوب صورت فراک پہنے ہوئے تھی اور اس کے ہاتھ میں تین رنگین غبارے تھے۔ بس میں کافی رش تھا۔ مگر غباروں کی کشش مجھے اور جمال کو لڑکی تک لے گئی۔ اس کے قریب پہنچ کر بھی بظاہر تو ہم بس سے باہر دوڑتے ہوئے بازاروں کی سیر کرتے رہے لیکن جب تیز ہوا سے اڑ اڑ کر اس کے رنگین غبارے ہمارے گالوں سے ٹکراتے تھے تو ہم انہیں چھوئے بغیر بھی نہ رہ سکے۔

"تم لوگی ؟" اس نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ایک غبارہ مجھے تھما دیا۔ پھر ایک جمال کو بھی دیا۔

"مجھے نہیں چاہئے۔" میں نے اس کا غبارہ لوٹانا چاہا۔

"نہیں، لے لو۔" اس کے لہجے میں شہنشاہوں کی سی سخاوت تھی، "میرے پاس تو ابھی دس غبارے اور ہیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد ہی ہمارے درمیان سخت دوستی نما دشمنی ہو گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں تھے۔ اُفوہ ـــــ کیا بتاؤں کہ وہ کتنی شیخی باز لڑکی تھی۔ وہ اپنی ماں کے زیورں کے بارے لے کر اپنے ڈیڈی کی موٹر سائیکل تک پر اترا رہی تھی۔ کہنے لگی، "میرے پاس سات نئی فراکیں رکھی ہیں۔" پھر کہا "میری گڑیا کا چھوٹا سا تو بنگلہ بھی ہے۔ اس کے اندر سچ مچ کی لائٹ جلتی ہے۔" پھر بولی، "میرے گڈے کے پاس ایک موٹر ہے۔ ایک تانگہ بھی

ہے۔ کبھی کبھی وہ گھوڑے کی سواری بھی کرتا ہے"۔

اس کے جھوٹ پر میری جان جل گئی۔ جی چاہا کہ ابا سے اس کی شکایت کر دوں۔ مگر وہ بس کے آخری کونے میں بیٹھے اپنے کسی دوست سے زوردار بحث کر رہے تھے اور ہماری موجودگی کو بالکل فراموش کر چکے تھے۔

"ہا ـــــ بچاری کے گڈّے کے پاس صرف ایک موٹر ہے۔ وہ بھی ٹوٹی پھوٹی ہوگی"۔ میں نے اُسے چڑانے کے لئے جمال سے کہا۔

"ہا ہا ہا"۔ جمال بھی جھوٹ موٹ ہنسنے لگی۔

"ہمارے گڈّے کے پاس تو نئی تین کاریں ہیں"۔ میں نے نہایت شان سے گپ ہانکی۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" اس نے پلکیں جھپکا کے بڑی دل چسپی سے پوچھا۔

"بھوت دور ـــــ" میں نے بہت کو خوب لمبا کر کے بتایا تاکہ وہ ہمارا جھوٹ دیکھنے کو کبھی وہاں جانے کا تصوّر بھی نہ کر سکے۔

"اور باجی اپنی گڑیوں کا تو ایک ننّھا سا باغ بھی ہے اس میں اتنے ننّھے ننّھے سیب انار، انگور سب لگا کرتے ہیں"۔ جمال نے آنکھ کے اشارے سے مجھے تائید کرنے کو کہا۔

"اچھّا تمہاری گڑیا کے پاس مسہری بھی ہے؟" وہ ہم سے بے حد مرعوب ہو گئی۔

"آں ہاں ـــــ" ہم دونوں نے ساتھ ساتھ اقرار کیا۔

"اُوں جھوٹ ـــــ" وہ مونہہ بنا کر بولی۔ پھر بڑی عورتوں کی طرح دیدے مٹکا کے کہا "اور اگر یہ جھوٹ ہوا تو؟"

"تو ہمارے کان کاٹ لینا بس ـــــ؟"

"سوشیلا چلو اُترو"۔ بس رکی تو اس کے ڈیڈی نے پکارا۔ اور اس نے ایک جھپٹّا مار کے اپنے غبارے ہم سے چھین لئے۔

اب ہم دونوں نے جو مڑ کے دیکھا تو ابا غائب تھے۔ وہ غالباً ہماری موجودگی کو فراموش کر کے اپنے اسٹاپ پر اُتر گئے تھے۔ جی دھک سے رہ گیا۔ اب کیا ہوگا؟ ہم دونوں ایک سُر ایک تال میں سسک سسک کر رونے لگے۔

بس کے مسافر ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے پولیس اسٹیشن پہنچانے کا مشورہ دیا کہ ابا ڈھونڈ لیں گے۔ چند مسافر جو ہماری شرارتوں پر خار کھائے بیٹھے تھے، اب رونے پر مارنے کی دھمکیاں دینے لگے۔

آخر سوشیلا کے باپ کو ہمارے یوں کلیجہ پھاڑ کے رونے پر ترس آ گیا۔ انہوں نے بس کنڈکٹر سے کہا کہ وہ ہمیں گھر تک پہنچا دے گا۔

رکشا میں بیٹھنے سے پہلے انہوں نے ہم تینوں کو آئس کریم کھلائی تو کچھ حواس ٹھیک ہوئے مگر آئس کریم ختم ہوتے ہی جمال کے آنسو پھر بہنے لگے ـــــ مزید آئس کریم کی اُمّید میں۔

سوشیلا بہت خوش تھی۔ کہنے لگی، "ڈیڈی ہم جمال کے ہاں شام تک رہیں گے۔ پھر مجھ سے کہا "کیا تمہاری گڑیا کے باغ میں چھوٹی چھوٹی نارنگیاں بھی لگتی ہیں؟"

یہ سُن کر میری تو جان ہی نکل گئی۔ میں نے سہم کر جمال کو دیکھا ابا کے کھو جانے کا غم تو بہت تھا، مگر اب رکشا میں سڑکوں پر تفریح کرنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ سوشیلا کے ڈیڈی کے لاکھ پوچھنے پر بھی ہم نہ بتا سکے کہ ہمارا گھر کون سے محلے میں ہے۔ ہم دونوں چپکے بیٹھے رہے۔ سوشیلا کے سامنے اپنی ناک تھوڑی کٹانا تھی۔ میری تو فکر کے مارے جان نکلی جا رہی تھی کہ کہیں گھر مل گیا تو وہ گڑیا کا بنگلہ اور گڈّے کی تین کاریں کہاں سے دکھائیں گے۔

اِدھر سوشیلا کا یہ عالم کہ جہاں کہیں کوئی خوب صورت بنگلہ نظر آتا اور وہ اپنے ڈیڈی سے تالیاں بجا کر کہتی "ڈیڈی

یہی ہے رضیہ کا گھر۔"

اُس کے ڈیڈی پُر اُمید نظروں سے ہمیں دیکھتے اور ہمارے انکار پر آگے بڑھ جاتے۔ راستے میں جتنے پولیس اسٹیشن ملے وہاں اُتر کے سوشیلا کے ڈیڈی ہمارے کھو جانے کی اطلاع دیتے گئے۔

پھر مجھے اچانک ایک بہت بڑے بنگلے کے سامنے آبا کھڑے نظر آئے اور ہم دونوں خوشی کے مارے چلّانے لگے۔

رکشا رک گئی۔ آبا بھی ہمیں دیکھ کر دوڑے۔ ادھر سوشیلا کے ڈیڈی اور سوشیلا بھی رکشا سے اُتر گئے۔ ہم دونوں نے آنکھیں مل مل کر دیکھا کہ وہ سچ مچ کے آبا ہیں اور ہمیں چپٹا چپٹا کر پیار کر رہے ہیں۔ سوشیلا کے ڈیڈی کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

"میں تو صاحب کے پاس آیا تھا ایک دن کی چھٹی کی درخواست لے کر۔ تاکہ بچوں کو ڈھونڈھنے نکل سکوں"۔ ڈیڈی کہہ رہے تھے۔ ہم دونوں ابھی تک خوب زور زور سے رو رہے تھے۔ اور ڈر رہے تھے کہ سوشیلا جو اس گھر کو ہمارا گھر سمجھے ہوئے ہے کہیں اندر جانے کی فرمائش نہ کرے۔ مگر آبا خود ہی سب کو اندر لے گئے۔

ایک نہایت آراستہ کمرے میں ایک موٹا ادھیڑ سا آدمی صوفے پر لیٹا سگار پی رہا تھا۔ اس نے اُٹھ کر ہم سب کا استقبال کیا۔ ہمارے مل جانے پر کچھ خوشی کا اظہار بھی ہوا۔ سوشیلا کی آنکھیں حیرت کے مارے چمک رہی تھیں۔ وہ کمرے میں رکھی ہوئی جاپانی گڑیاں، کانسے کے اسٹیچو اور شوکیس میں رکھی ہوئی جگمگاتی چیزوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ سوشیلا کے ڈیڈی خوب بڑھا چڑھا کر اپنی کارگزاری سُنا رہے تھے کہ انہوں نے ہمیں کتنے روپے کی آئس کریم کھلائی اور کتنی دیر رکشا کی سیر کرائی۔ آبا اور ان کے صاحب بار بار ان کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ پھر جب وہ جانے کے لئے اُٹھے

اُوپر کی منزل پر رہنے کا فائدہ

تو سوشیلا اُن کی ٹانگوں میں جھول گئی اور کہنے لگی، "ڈیڈی یہاں گڑیا کا گھر ہے۔ ہمیں دکھایئے"۔

"پاگل کس نے کہہ دیا کہ یہاں گڑیا کا گھر ہے"۔ اس کے ڈیڈی نے جھڑک دیا۔

میں اور جمال بے حد سہمے ہوئے ایک کونے میں کھڑے تھے۔

"اچھا اچھا ــــــ ایک گڑیا کا گھر ہے تو ہمارے ہاں" آبا کے صاحب نے کہا اور پھر کمرے کا پردہ اُٹھا کر ہم تینوں سے بولے، "جایئے اندر جایئے"۔ پھر جانے کسے آواز دی کہ ہمیں گڑیوں کا گھر دکھا دیں۔

ایک خوب صورت سی دبلی پتلی عورت کمرے میں آئی۔ اس نے بہت اچھا میک اَپ کیا تھا اور بہت اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ ایک اور کمرے میں لے گئی۔

ہائے اللہ، کیا بتاؤں ــــــ کسی لڑکی نے آج تک ایسا حسین خواب نہ دیکھا ہوگا جو ہم نے دیکھا۔ وہاں تو گڑیوں کا محل

تھا۔ کہیں لان میں بچے گیند بلا کھیل رہے ہیں اور کمرے میں بیٹھے ماں باپ تاش میں مصروف ہیں۔ اندر ریڈیو رکھا ہے۔ نوکر چائے کی ٹرے لئے جا رہے ہیں۔ گیرج میں پانچ تین کاریں کھڑی ہیں اور ایک ننھی سی پرام میں آیا ایک ننھے سے بچے کو لئے جا رہی ہے۔

ایک چیز ہو تو بیان کی جائے۔ یوں لگتا تھا، الہ دین کے چراغ والے جن نے کسی لڑکی پر مہربان ہو کر اس کی ہر خواہش پوری کر دی تھی۔

سوشیلا کے ڈیڈی کی آواز سن کر ہم سب چونکے تو وہ خوب صورت عورت کہہ رہی تھی، "سروج میوزک سیکھنے گئی ہے۔ ورنہ وہ خود تمہیں ہر چیز دکھاتی۔"

جب ہم باہر آئے تو ہمارے دل وہیں اندر رہ گئے تھے اور ہم سوشیلا کی موجودگی کو بالکل بھلا چکے تھے۔ وہ باہر آتے ہی اپنے ڈیڈی سے لپٹ گئی اور ایک ایک چیز کی تفصیل سنانے لگی۔

پھر وہ سیڑھیاں اترنے سے پہلے مجھ سے بولی، "اب ہم تمہیں اپنے گھر نہیں بلائیں گے۔ میں نے جھوٹ کہا تھا میرے پاس صرف یہی تین غبارے ہیں۔ یہ تم لے لو۔ مگر کل پھر مجھے اپنی گڑیوں کا باغ دکھانے ضرور بلانا ——"

زینے سے نیچے اترتے ہوئے وہ اپنے ڈیڈی سے کہہ رہی تھی، "ڈیڈی میں سمجھتی تھی وہ لڑکیاں جھوٹ بول رہی ہوں گی۔ کیوں ڈیڈی یہ لوگ بہت امیر ہوں گے نا؟"

اس واقعہ کو گزرے ہوئے برسوں بیت گئے ہیں۔ مگر آج تک مجھے اپنے اس جھوٹ پر حیرت ہوتی ہے جو سچ بننے پر تلا ہوا تھا۔ ■■

جو کچھ جہاں میں ہے
شبستاں میں ہے
ادارہ شمع کی یہ فخریہ پیش کش دنیا کے کسی بھی عمدہ سے عمدہ ڈائجسٹ سے بہتر قرار دی گئی ہے۔ اسے پورے جہاں کے باغ ادب سے چیدہ چیدہ پھول لے کر سجایا گیا ہے — اس میں وہ سب کچھ ہے جس سے آج تک اُردو داں طبقہ محروم تھا۔ دوسرا شمارہ بازار میں اور ریلوے بک سٹالوں پر آگیا ہے۔ آج ہی اسے حاصل کیجئے۔ کہیں پچھلے ماہ کی طرح آپ محروم نہ رہ جائیں۔ ایک شمارہ کی قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے ہے۔
شبستاں اُردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ، نئی دہلی

کل کے شاعر

نریش کمار شاد

بھاری شاعر ہلکے شاعر
یہ بچے ہیں کل کے شاعر

صدر : سُننے والو! چپ ہو جاؤ — روشن لال اب شعر سُناؤ

روشن : نام ہے روشن دل روشن ہے — میرا مستقبل روشن ہے
یارو! اک ناکارہ ہوں میں — روشن ایک ستارہ ہوں میں
چمکوں گا میں دُنیا بھر میں — شہرت ہو گی نگر نگر میں
محتاجوں کو شاد کروں گا — اُجڑے گھر آباد کروں گا

صدر : شعر ذرا نکہت کے سُنئے — سُنئے اور اپنا سر دُھنئے

نکہت : مجھ کو تم ناچیز نہ جانو — میرا نام ہے نکہت بانو
میں پھولوں میں رہنے والی — باغوں کے آغوش کی پالی
نرم ہوا میں جھولا جھولوں — چاہوں تو آکاش کو چھُو لوں
مست ہوں مستی بکھراؤں گی — دُنیا بھر کو مہکاؤں گی

صدر : سوچو، سمجھو، غور کرو سب — ارجن سنگھ کے شعر سُنو اب

ارجن : میں ہوں اپنی آن کا پکّا — دیکھ کے ہیں سب ہکّا بکّا
میں بھارت کی شان بنوں گا — ارجن سا بلوان بنوں گا
دشمن ہوں میں بٹ ماروں کا — دوست ہوں لیکن دُکھیاروں کا
ظلم کی ظلمت دُور کروں گا — دنیا کو پُر نور کروں گا

صدر : تھام لیں دِل کو سارے بھائی — اب آشا کی باری آئی

آشا : کون ہوں میں یہ جان سکیں گے — دل والے پہچان سکیں گے
لوگ مجھے کہتے ہیں آشا — جانتی ہوں میں دل کی بھاشا
سُن کر آہٹ میرے قدم کی — چھَٹ جاتی ہے بدلی غم کی
دل والے دل شاد ہیں مجھ سے — دِل کے نگر آباد ہیں مجھ سے

صدر : عِلم الدین اسٹیج پر آئے / اپنے تازہ شعر سُنائے
علم الدین : پڑھنا لکھنا کام ہے میرا / سب سے پیارا نام ہے میرا
بول کروں گا عِلم کا بالا / پہنوں گا خوشیوں کی مالا
عِلم سے جو محروم رہے گا / دُکھ جھیلے گا رنج سہے گا
عِلم ہے سچّا نور اے یارو / عِلم ہے کوہِ طور اے یارو
صدر : ہنس مکھ رائے اب تم آؤ / آکر اپنے شعر سُناؤ
ہنس مکھ : ہنس مکھ رائے نام ہے میرا / خوش رہنا ہی کام ہے میرا
ہر مشکل سے لڑجاتا ہوں / ہر آفت سے ٹکراتا ہوں
جان میں جب تک جان رہے گی / ہونٹوں پر مسکان رہے گی
مردوں کا انداز یہی ہے / جینے کا بھی راز یہی ہے
صدر : آخر کیوں چپ چاپ رہو تم / سلطانہ اب شعر کہو تم
سلطانہ : ناز ہے مجھ کو ہوں سلطانہ / میرا ہے محتاج زمانہ
میں محلوں میں رہنے والی / رُتبہ میرا سب سے عالی
بستی بستی راج ہے میرا / تخت ہے میرا تاج ہے میرا
کمزوروں کی رکھشک ہوں میں / نردوشوں کی سیوک ہوں میں
صدر : غور سے سُن لیں سارے بھائی / شعر پڑھے گا اب سودائی
سودائی : میرا تخلص سودائی ہے / عقل گنوا کر عقل آئی ہے
دُنیا والو! عقل کے مارو! / سُن لو ہوش کے ٹھیکے دارو!
تم سے میرا من اچھا ہے / میرا پاگل پن اچھا ہے
ہنس لیتا ہوں گا لیتا ہوں / جو ملتا ہے کھا لیتا ہوں

پُرسکون گھریلو زندگی

ہم اور آپ اپنے گھر میں کس طرح خوش و خرم رہ کر زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ جاننے کے لئے اس کتاب کو ضرور پڑھئے۔ قیمت : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

پنچائتی راج

پنچائتی راج کیا ہے؟ اور اس کا قیام عوام کے لئے کس قدر ضروری اور کتنا فائدہ مند ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے یہ کتاب ضرور پڑھئے۔ قیمت ۲۵ پیسے

مچھلیاں

مچھلیاں کتنے قسم کی ہوتی ہیں۔ ان کی کیا بناوٹ ہوتی ہے یہ کس زمانے میں اور کہاں کہاں پائی جاتی ہیں، اور کیا کھاتی پیتی ہیں۔ قیمت ۷۵ پیسے

سائیکل کی کہانی

آج کل سب سے زیادہ مقبول سواریوں میں سائیکل کا شمار ہوتا ہے مگر یہ کب اور کس طرح ایجاد ہوئی سائیکل کی کہانی پڑھ کر معلوم ہو جائے گا۔ قیمت : ۵۰ پیسے

احباب قاعدہ

(اول و دوئم) پروفیسر سید احتشام حسین نے یہ قاعدہ اس لئے مرتب کیا ہے کہ اس کی مدد سے ہندی پڑھے ہوئے آسانی سے اردو پڑھ لیں گے اور اُردو پڑھے ہوئے آسانی سے ہندی سیکھ لیں گے۔ دونوں حصوں کی قیمت ۹۰ پیسے

زمین کی کہانی

جس زمین پر ہم اور آپ رہتے ہیں۔ اس کے متعلق اگر کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو زمین کی کہانی ضرور پڑھئے۔ ۵۰ پیسے

سورج اور اس کا گھرانا

جس طرح ہمارا اور آپ کا ایک گھرانا اور خاندان ہے۔ کیا اسی طرح سورج کا بھی کوئی خاندان ہے؟ اگر یہ بات معلوم کرنا ہو تو سورج اور اس کا گھرانا پڑھئے ۷۵ پیسے

کچھ نئی ایجادیں

اس چھوٹی سی کتاب میں ٹیلی وژن، راڈر ٹیلی فون اور ٹیلی پرنٹر کے متعلق بہت سی مفید اور معلوماتی باتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ قیمت : ۷۵ پیسے

بابر ہندوستان میں

پہلا مشہور مغل بادشاہ بابر ہندوستان کی عظیم سلطنت کا شہنشاہ کیسے بنا اس نے اس نے کیا مصیبتیں اٹھائیں، اور بعد میں کس طرح اپنی حکومت کے دوران اس نے انتظام کیا، یہ جاننے کے لئے قاسم صدیقی کا لکھا ہوا بابر نامہ ضرور پڑھیں۔ قیمت : ۷۵ پیسے

بھارت کی کہانی

یہ بھارت کی کہانی کسی پریوں کے دیس کی نہیں بلکہ یہ نہاتما گاندھی اور چاچا نہرو کے عظیم دیس کی کہانی ہے جسے خود بھارت کی ترقیوں نے اپنی زبان سے بیان کیا ہے۔ قیمت : ۷۵ پیسے

موسم کی کہانی

ہندوستان میں کتنے موسم ہوتے ہیں، اس پر قاسم صدیقی صاحب نے ڈرامے کے دلچسپ انداز میں موسموں کا حال بیان کیا ہے۔ قیمت ۵۰ پیسے

تاریخی کارنامے

اس کتاب میں تاریخ میں گزرے ہوئے مشہور بادشاہوں کے کارنامے بہت دلچسپ طریقے سے بیان کئے گئے ہیں جس کو ختم کئے بغیر چھوڑنے کو دل نہیں نہیں چاہتا کامل چار حصّوں میں۔ چاروں کی قیمت : تین روپے

لسانیات اور اُردو

اُردو زبان کے رسم خط کے بارے میں طالب علموں کے لئے مفید اور معلوماتی کتاب۔ ایک روپیہ

جدید ایرانی ادب

فارسی ادب کے طلبار کے لئے ایک نہایت ضروری اور اہم کتاب۔ قیمت ۷۵ پیسے

معلومات کی پہلی کتاب

عام معلومات اور تمباکو، چائے کافی اور قہوہ کے متعلق اس کتاب میں مصنف نے بڑی دلچسپ باتیں بتائی ہیں جس سے ان چیزوں کا نفع اور نقصان معلوم ہوتا ہے۔ ۵۰ پیسے

معلومات کی دوسری کتاب

اس کتاب میں مصنف نے فضا، آسمان کہکشاں چاند اور سورج وغیرہ کے متعلق بہت سی ضروری معلومات یکجا کر دی ہیں جو طالب علموں کے لئے بہت ضروری ہیں۔ ۷۵ پیسے

شکاری پرندے

کون کون سے پرندے شکاری ہوتے ہیں۔ ان کی عادتیں، ان کا رہن سہن۔ غرضکہ ان شکاری پرندوں کے متعلق تمام ضروری باتیں اس کتاب میں درج ہیں۔ قیمت ۷۵ پیسے

قدیم دنیا کے سات عجائبات

آج سے بہت پہلے دنیا کے جو سات عجائبات مشہور تھے وہ کہاں تھے اور کس نے انہیں بنوایا تھا۔ ساتوں عجائبات کی تصویریں بھی اس کتاب میں ہیں۔ قیمت : ۶۰ پیسے

بیت بازی

بیت بازی طالب علموں کا ایک اعلیٰ اور معیاری کھیل ہے بہترین شعر یاد کرنے کے لئے بیت بازی ضرور پڑھئے۔ ۵۰ پیسے

کھلونا بک ڈپو آصف علی روڈ نئی دہلی

دادی ماں

رام لعل

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہمارے یہاں نیپال سے میرے ایک دوست کی لڑکی گلے کا آپریشن کرانے آئی تھی۔ اس کا نام تھا نورُوپ۔ وہ ہائی اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا آپریشن ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی کچھ دن اور اُسے ہمارے یہاں رہنا تھا۔

ایک دن صبح صبح ہی اُسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ ہنستی ہی چلی گئی۔ میں اس وقت دفتر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا اس کی ہنسی سن کر میں نے اُسے اپنے کمرے میں سے ہی پکار کر کہا، "اری نورُوپ، اتنی زور سے نہ ہنسو، نہیں تو تمہارا حلق پھٹ جائے گا۔ پہلے ہی آپریشن کی وجہ سے زخمی ہے۔"

اُس نے اُسی طرح ہنستے ہوئے جواب دیا "انکل پہلے یہاں تو آیئے۔ اِس لڑکی نے تو میرا ناک میں دَم کر رکھا ہے۔"

اُس کا اشارہ میری بیٹی سنگیتا کی طرف تھا۔ وہ دس سال کی تھی۔ میں ٹائی باندھتے باندھتے وہاں چلا گیا تھا جہاں وہ

فقیر کے کودنے کے لئے کیلوں کا ہی بستر ہونا چاہئے تاکہ وہ آرام سے اُتر آئے

دونوں موجود تھیں۔ سنگیتا اسکول جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ اسکول کے دِل کش ڈریس میں اور کتابوں سے ٹھسا ٹھس بھرا ہوا بیگ کندھے سے لگائے ہوئے اُس وقت وہ نورُوپ کی طرف بڑے غصّے سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

نورُوپ بولی، "انکل، میں جب سے اسپتال سے آئی ہوں یہ لڑکی مجھے کچھ کھانے پینے نہیں دیتی۔ کبھی کہتی ہے گرم گرم کھانا نہ کھایا کرو، تمہیں اس کے لئے ڈاکٹر صاحب منع کر چکے ہیں۔ کبھی کہتی ہے، یہ کھٹّی میٹھی چیزیں نہ کھاؤ۔ سیب، انگور، سنگترے وغیرہ ہر چیز اس کے نزدیک کھٹّی ہے۔ ہر چیز گلے کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اب آپ ہی اسے سمجھایئے، میں کچھ بھی نہیں کھاؤں گی تو زندہ کیسے رہوں گی؟"

اُس کی بات سن کر سنگیتا نے کہا، "دیدی تم بے کار کی باتیں بہت کرتی ہو بھلا کوئی بھوکا رہنے سے اتنی جلدی کیسے مر سکتا ہے؟ معلوم ہے مہاتما گاندھی نے کتنے کتنے دن تک برت رکھا تھا تب بھی انہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔ تم صرف ایک ہفتہ تک گلے کو نقصان پہنچانے والی چیزیں نہ کھاؤ۔"

اتنی چھوٹی سی بچّی کے مونہہ سے اتنی سمجھ داری کی باتیں سن کر ہی نورُوپ کو ہنسی آرہی تھی۔ وہ مجھ سے کہنے لگی "دیکھ لیا انکل! یہ مجھ پر اس طرح ہی حکم چلایا کرتی ہے ــــ یہ کتاب نہ پڑھو، اس کے حرف بہت باریک ہیں، تم لیٹ کر کیوں پڑھا کرتی ہو؟ تمہاری نظر خراب ہو جائے گی۔ یہ تمہارے دوپٹّے کا رنگ کیسا ہے؟ تمہارے نیپال میں اتنے بھڑکیلے رنگ کیوں پسند کئے جاتے ہیں ــــ اُفوہ! اس کی باتیں سُن سُن کر تو میں عاجز آگئی ہوں۔ لڑکی کیا ہے، باتوں کا پٹارہ ہے! اسے آپ نے نہ روکا تو میں نیپال لوٹ جاؤں گی۔"

ان دونوں کی باتیں سُن کر مجھے ہنسی آگئی۔ اتنے میں دوسرے کمرے سے نکل کر میری بیوی بھی وہاں آگئی۔ اُس نے سنگیتا سے پوچھا، "تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟ معلوم بھی ہے اسکول جانے کا ٹائم ہو چکا ہے۔ ابھی تو تمہیں ناشتہ بھی کرنا ہے نا!"

سنگیتا نے میری طرف دیکھا۔ میں ہی اُسے اپنے اسکوٹر پر اسکول چھوڑ آتا تھا۔ پھر اُدھر سے ہی اپنے دفتر چلا جاتا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا "ممّی آج میں ناشتہ ساتھ لے جاؤں گی۔"

اس کی ماں نے اس سے کہا، "تم اپنے سے بڑوں کے ساتھ بات بے بات بحث کیوں کرنے لگتی ہو؟"

میرے دفتر جانے سے پہلے نورُوپ نے مجھے یاد دلایا "انکل جلدی لوٹیے گا نا! آج فلم دیکھنے کا پروگرام ہے!"

یہ سن کر سنگیتا اپنے ناشتے کا ڈبہ اٹھائے ہوئے پھر اس کے پاس جا کھڑی ہوئی، بولی "دیدی زیادہ فلمیں دیکھنا اچھی عادت نہیں ہے۔ تم ہر وقت فلمی رسالے بھی نہ پڑھا کرو۔ اس سے دِل ہر وقت نئی سے نئی فلم دیکھنے کو چاہتا ہے۔"

اچھا دادی ماں، اچھا۔ اب اپنا بھاشن ختم کرو۔" نورُوپ نے اُس کے سامنے ہار مان کر ہاتھ جوڑ دئے۔

سنگیتا چڑ کر بولی "لیکن تم نے مجھے دادی ماں کیوں کہا۔ میں تو تم سے چھوٹی ہوں۔"

نورُوپ بولی، "نہیں تم چھوٹی نہیں ہو، سو فی صدی میری دادی ماں ہو۔ تمہاری باتیں ہی ایسی ہوتی ہیں۔ آج سے میں تمہیں دادی ماں ہی کہا کروں گی۔ دادی ماں! دادی ماں! دادی ماں!! دیکھتی ہوں تم میرا کیا بگاڑ لوگی!"

میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے سنگیتا کو پکارا "اچھا اب چلو نا دادی ماں! نہیں تو دیر ہو جائے گی۔"

میرے مونھہ سے بھی اپنے لئے دادی ماں کا لقب سن کر سنگیتا حیران رہ گئی۔ اسکوٹر پر میرے پیچھے بیٹھ کر بولی "ڈیڈی آپ نے مجھے دادی ماں کیوں کہا؟ میں دادی ماں تھوڑی ہوں۔ دادی ماں تو دلّی میں رہتی ہیں۔ وہ سنیں گی تو کیا کہیں گی؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "وہ کچھ بھی نہیں کہیں گی، بلکہ خوش ہی ہوں گی کہ میری ایک بہن اور آ گئی۔"

سنگیتا بولی، "ہٹئے! میں دادی ماں کی بہن تھوڑی ہوں! اُن کی پوتی ہوں۔ آپ کو نہیں معلوم؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "وہ تو معلوم ہے۔ لیکن تم باتیں جو بالکل دادی ماں جیسی کیا کرتی ہو، اس لئے تم اُن کی بہن ہی ہو سکتی ہو!"

اُس روز شام کو سنگیتا اسکول سے لوٹی تو نورُوپ نے اُسے دیکھتے ہی "آگئی دادی ماں! آگئی دادی ماں!" چلّانا شروع کر دیا۔ ہم اُس وقت برآمدے میں بیٹھے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ سنگیتا نے نورُوپ کو کوئی جواب نہ دیا بلکہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی۔ وہاں کتابوں کا بیگ رکھ کر لوٹ آئی اور نورُوپ کے سامنے کھڑی ہو کر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی، "دیدی میں سمجھ گئی تم مجھے دادی ماں کیوں کہتی ہو۔ کیوں کہ میں تمہیں اچھی اچھی باتیں جو سمجھاتی ہوں، جن سے تمہیں فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اگر تم یہ نہیں چاہتیں تو میں آئندہ تم سے کچھ بھی نہیں کہوں گی۔"

سنگیتا کو اتنی جلدی ہار مانتے دیکھ کر نورُوپ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ لیکن سنگیتا نے فوراً اُسے ٹوک دیا "دیکھو دیکھو دیدی! ڈیڈی نے صبح بھی تمہیں منع کیا تھا کہ اتنی زور سے نہ ہنسا کرو نہیں تو تمہارا حلق پھٹ جائے گا۔"

سنگیتا نے میری طرف بھی دیکھا تاکہ میں اُس کی تائید میں نورُوپ سے کچھ کہوں۔ لیکن نورُوپ نے اسے اپنی طرف کھینچ کر پیار سے گلے سے لگا لیا اور کہا، "اب تو تم کچھ بھی کہو، لیکن ہو میری دادی ماں ہی! میری گڑیا دادی ماں!"

اب گھر میں دن رات ایک نئی تکرار رہنے لگی۔ نورُوپ اُسے دادی ماں کہہ کہہ کر چڑاتی اور سنگیتا اُسے ڈانٹا کرتی۔ کبھی کبھی اُسے

سمجھانے بھی بیٹھ جاتی۔ ہوتے ہوتے سنگیتا کا یہ نیا نام محلّے کے دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی معلوم ہوگیا جو اس کے ساتھ پڑھتے اور کھیلتے تھے وہ بھی اُسے دادی ماں کہنے لگے۔ سنگیتا کے لئے اس اس نام سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا۔ اس نے سب سے بہت کچھ کہا سُنا، کسی کے ساتھ جھگڑا کیا، کسی منّت سماجت کی۔ ان لوگوں کے بھی عجیب عجیب سے نام گھڑے ——— بلّی، ہاتھی، بندر، گوبھی کا پھول، پادری صاحب، کدّو وغیرہ کئی نام۔ لیکن کسی پر کوئی نام بھی اِس طرح نہ چپک سکا جس طرح اُس پر دادی ماں کا نام چپک کر رہ گیا تھا۔ یہ نام اس کے مزاج کے عین مطابق تھا اور وہ سب سنگیتا کے مزاج سے بھی اچھی طرح واقف تھے، اس لئے سب کو اُسے اِس نام سے پکارنا اچھا معلوم ہوتا۔ ہم، یعنی میں اور میری بیوی بھی اُسے اس نام سے پکارنے لگے تھے۔

اُن ہی دنوں اس کی آنکھیں خراب رہنے لگیں۔ اُسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جاکر دکھایا تو ڈاکٹر نے اس کے عینک لگوانے کا مشورہ دیا۔ اس کی نظر کچھ کم زور ہوچکی تھی، لہٰذا اور زیادہ کم زور ہونے سے بچانے کے لئے اس کے لئے عینک کا استعمال ضروری ہوگیا تھا۔ لیکن سنگیتا نے عینک لگوانے سے بالکل انکار کردیا۔ ڈاکٹر نے اور ہم نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔ عینک بنواکر گھر میں لے آئی گئی، لیکن وہ یوں ہی دھری رہی۔ سنگیتا نے عینک کو چھونا تک منظور نہ کیا۔

ایک دن نورُوپ نے اچانک اس کی عینک نہ لگانے کی ضد کا راز معلوم کرلیا۔ اس نے ہم سب کو بتایا، "وہ عینک اس لئے نہیں لگانا چاہتی کہ اسے لگاکر وہ سچ مُچ ہی دادی ماں نظر آئے گی۔"

چھوٹے بچّوں کے چہرے پر عینک واقعی بہت عجیب سی لگتی ہے۔ لیکن جب کسی بچّے کی نظر ہی کم زور ہوجائے تو پھر اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ لیکن سنگیتا کے انکار کی وجہ جان کر ہم سب خوب ہنسے۔ اس کا عینک نہ لگانے کا راز سچ مُچ ہی یہی تھا۔

ایک دن اسکول جاتے وقت سنگیتا نے اپنے آپ ہی عینک اٹھاکر لگالی۔ اس پر ہم سب حیران رہ گئے۔ ایسا اس نے کس کے سمجھانے پر کیا؟ گھر میں تو وہ کسی کا کہنا ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئی تھی۔ اب تو ہم نے ہار کر اس سے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

شام کو وہ اسکول سے لوٹی تو اُس وقت بھی وہ عینک لگائے ہوئے تھی اور بڑی خوش بھی تھی۔ عینک لگائے لگائے وہ ہر طرف پھرتی رہی۔ ہم سب بھی مطمئن تھے۔ آخر اُس نے اپنی ضد چھوڑ ہی دی۔ لیکن اس کی وجہ جاننے کے لئے ہم بہت بیتاب تھے۔

وجہ کا پتہ بھی نورُوپ نے ہی لگالیا۔ ایک دن وہ اُس کے اسکول میں گئی۔ وہاں جاکر اس نے جو کچھ دیکھا وہ نظارہ بہت ہی دل چسپ تھا۔ وہاں سے واپس آکر اس نے ہمیں بتایا، "اپنی کلاس میں صرف دادی ماں ہی عینک لگانے والی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ پڑھنے والی دس اور لڑکیاں بھی عینک لگاکر آتی ہیں اور اُن سب کو آگے ایک ہی قطار میں بٹھایا جاتا ہے۔ انہیں دیکھ کر مجھے تو ایسا لگا جیسے وہ دادی ماں کی ہی کوئی کلاس ہو!"

یہ سُن کر ہم سب خوب ہنسے۔ ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بَل پڑ پڑ گئے۔ لیکن سنگیتا نے جو یہ سب سُن رہی تھی، بڑی سنجیدگی سے نورُوپ کو سمجھاتے ہوئے کہا، "اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے دیدی؟ اس دیش کو دادی ماؤں کی ہی ضرورت ہے ——— تم جیسی لڑکیوں کو سمجھانے کے لئے!"

اب سنگیتا اس نام سے کبھی نہیں چڑتی۔ نورُوپ نیپال واپس جاچکی ہے۔ وہاں سے کبھی کبھی اس کا سنگیتا کے نام خط آتا ہے تو اس میں بھی وہ اُسے 'میری پیاری دادی ماں' لکھنا کبھی نہیں بھولتی۔ اور سنگیتا بھی اپنے جواب میں اُسے بڑی بوڑھیوں کے سے انداز میں نصیحتیں کرنا ہرگز نہیں بھولتی۔ ■■

یہ انعامی پہیلیاں ہیں اسی لئے ہم ان کے جواب شائع نہیں کر رہے، تم ان پہیلیوں کے جواب ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر "انعامی پہیلیاں، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱" کے پتے پر بھیج دو۔ ۲۵ فروری ۱۹۶۷ تک ملنے والے صحیح جوابوں میں سے دس بہن بھائیوں کو ایک ایک روپیہ انعام دیا جائے گا۔

انعامی پہیلیاں

پرویز شاہدی

۱

میرا کاجل میرے آنسو
قطرہ قطرہ میرا جادو
میری کالی اوس بکھیرے
اپنی اک اک بوند سے خوشبو
کاغذ کا غذ پھول کھلائیں
بل کھاتے، لہراتے گیسو

کون ہوں میں کیا نام بتاؤں؟
تم سے سُنوں تو خوش ہو جاؤں

۲

رنگ کا گرچہ کالا ہوں میں
روشن قسمت والا ہوں میں
چُولھا مجھ سے آس لگائے
کھیتی کا اَن داتا ہوں میں
جگ جگ جگ کے بھاگ جگاتا
دُنیا بھر کا اُجالا ہوں میں

کرتا ہوں کیا کام نہ پوچھو
جانتے ہو تو نام نہ پوچھو

۳

ہاتھوں کے بل چلتی ہوں میں
کتنی چنچل لڑکی ہوں میں
دونوں ہاتھ ہیں ٹانگیں میری
پاؤں سے آگے جاتی ہوں میں
دنیا مجھ سے چلنا سیکھے
دُنیا کی اُستانی ہوں میں

نام نہ پوچھو دیکھنے والو!
مجھ سے اپنی بگڑی بنا لو!

۴

محفل محفل خلوت خلوت
میرے پروں سے برسے راحت
ٹھنڈک میرے بازو پکڑے
سر پہ ناچوں مور کی صورت
ناچنا میرا دل کو لبھائے
گرمی سے ہے مجھ کو نفرت

میں بجلی کا پُوت ہوں بچّو!
اب تو میرا نام بتا دو

۵

کُنڈلی مارے ناچنا میرا
دیکھ کے مجھ کو سانپ نہ کہنا
میرے پیٹ میں مُنہ کی پونجی
آوازوں کی میں ہوں تجوری
مجھ میں تم آوازیں ڈالو
یعنی مُنہ کا بینک ہوں، بچّو!

مجھ کو بڑی اُمید ہے تم سے
کون ہوں، کیا ہوں؟ اب بھی نہ سمجھے؟
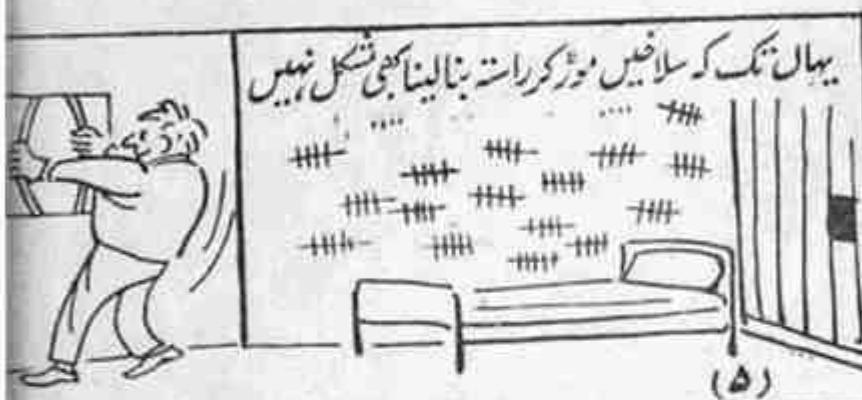
نئی ترکیب
صبح ہوگئی
(۱)
ورزش شروع کرنی چاہیئے
(۲)
طاقت آرہی
(۳)
اور زیادہ طاقت
(۴)
یہاں تک کہ سلاخیں موڑ کر راستہ بنالینا بھی مشکل نہیں
(۵)
غضب ہوگیا ۔ وارڈر آگیا ۔ اسے شک ہوا کہ قیدی نکل گیا
(۶)
اُس نے پستول نکالا ....
(۷)
اور سلاخوں کے درمیان بنے ہوئے راستے سے گھسنے لگا
(۸)
قیدی نے سلاخوں کو پھر موڑ کر وارڈر کو جکڑ دیا اور خود دروازے سے باہر نکل گیا
(۹)

بہادری کا تمغہ

ہاجرہ نازلی

میر صاحب بہت بہادر تھے۔ اب اگر کسی نے یہ سوال کر دیا کہ کتنے بہادر تھے ؟ تو اس کا جواب دینا ہمارے بس میں نہیں ہے، کیوں کہ اُن کی بہادری معمولی تو تھی نہیں جس کو دو لفظوں میں بیان کیا جاسکے۔ خیر پہلے میر صاحب کا تعارف تو کرا دیں۔ مگر ٹھہریئے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ تعارف کیسے کرائیں۔ چھوڑیئے اب ان مٹھی بھر ہڈیوں کا تعارف ہی کیا آپ خود ہی ان سوکھی سڑی ہڈیوں پر جھلّی سی کھال منڈھ کر میر صاحب کا تصوّر کر لیجیے جو بہت بہادر ہیں۔ اتنے بہادر کہ اگر بے خیالی میں چوہا کود جائے تو میر صاحب دل کو ہاتھوں سے تھام کر آٹھ دس قلابازیاں کھا جائیں اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو دو گھنٹے سانس درست نہ ہو۔ چور، ڈاکو کے تصوّر سے ہی رُوح فنا ہوجائے۔ بھوت پریت پر ایسا یقین کہ طلسم ہوش ربا کا ایک ایک لفظ سچ سمجھتے ہیں۔ لیکن اِن باتوں سے میر صاحب کی بہادری پر ہرگز کوئی حرف نہیں آتا بہادری مُسلّم ہے بلکہ مستند ہے اس لیے کہ میر صاحب کے پاس بہادری کا تمغہ موجود ہے اور ایک بندوق ہے جو ان کو بہادری کے صلے میں سرکار سے ملی تھی۔ ظاہر ہے بغیر بہادری دکھائے سرکار کسی کو تمغے نہیں بخش دیتی۔

اُن کے بہادری کے کارنامے کے سنانے سے پہلے ایک۔ آدھ بات بطور تعارف سُن لیجیے تاکہ سند رہے۔

میر صاحب کے اندر سینکڑوں خوبیاں ہیں انہیں میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اس قدر "ڈینگ مارو" واقع ہوئے ہیں کہ جیسے تمام دنیا کے بہادرانہ کارنامے وہ انجام دے چکے ہیں کہیں بھی کوئی ہمّت و بہادری کا واقعہ پیش آجاتا تھا یا کوئی واقعہ سننے

میں آجاتا تھا بس فوراً میر صاحب اپنی ٹانگ گھسیڑ دیتے تھے ایک بار چند شکاری اپنے کسی شکار کا تذکرہ کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ انگوٹھے برابر چرخ سے میر صاحب اپنا کوئی کارنامہ نہ بیان کرتے انہوں نے شکاریوں کو بیچ میں ٹوک کر کہا۔

"تم کیا شکار کھیلو گے، شکار کھیلنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے، ہم نے شیر کا شکار کیا تھا، کیسی بندوق اور کس کی رائفل، ایک چھرا لے کر ہم شیر کو لپٹ پڑے تھے، اتفاق ایسا ہوا کہ اسی وقت شیر نے جماہی لی، ہم اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے اور مع چھرے کے غڑاپ سے شیر کے پیٹ میں اتر گئے۔ شیر تو گھبرا اٹھا کیوں کہ پورے آدمی کا ہضم کرنا ہنسی کھیل نہیں تھا، لگا لوٹیں لگانے لیکن ہم ٹھہرے پشتینی بہادر، کیسی گھبراہٹ اور کس کا ڈر، فوراً ہی اپنے چھرے سے شیر کا پیٹ پھاڑ کر صاف باہر نکل آئے۔"

شکاریوں نے گردن ہلا کر تائید کی اور میر صاحب ان کو عش عش کرتے چھوڑ کر وہاں سے چل دیے۔ اور شکاری بیٹھے سوچتے رہ گئے کہ تقسیم عقل کے وقت غالباً میر صاحب شیر کے شکار ہی کے لئے گئے ہوئے ہوں گے۔

میر صاحب ہر بہادری کو سینہ ٹھونک کر اپنی ذات سے منسوب کر لیتے تھے حالانکہ حال یہ تھا کہ اچانک بکری بھی نظر آ گئی تو پیلے پڑ جاتے تھے جیسے یرقان کے مریض ہیں مگر خوف دور ہوتے ہی وہ پھر خم ٹھونک کر اسی جاہ و جلال سے ڈینگیں مارنے لگتے تھے جیسے اُن سے بڑا بہادر کبھی کوئی پیدا ہی نہیں ہوا اور لوگ اُن کی اس سینہ زوری کو حیرت سے دیکھتے رہ جاتے تھے۔

لیکن ان کی اسی سینہ زوری نے ان کی بہادری کا لوہا منوا کر ہی چھوڑا تھا ویسے ان کی بہادری صرف زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھتی تھی مگر کہتے ہیں کہ جس کی زبان چلے اس کے بارہ بل چلتے ہیں۔

ایک بار فجا نائی کا لڑکا دھوپ میں بیٹھا ہوا جسم پر تیل کی مالش کرا رہا تھا، میر صاحب بھی پہنچ گئے اور فجا کا کسرتی بدن دیکھنے لگے، فجا کی کمر پر ایک پھوڑے کا نشان تھا میر صاحب کی نظر اس نشان پر پڑی تو ملامت کے انداز میں بولے۔

"شرم نہیں آتی پیٹھ پر نشان دکھاتے ہوئے بات تو جب تھی کہ یہ نشان سینے پر ہوتا۔"

فجا نے حیرانی سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیسا نشان میری کمر پر تو پھوڑا نکلا تھا میں اُسے سینے پر کیسے نکال لیتا ——؟"

"ابے میر صاحب نے طنز و تمسخر سے کہا" دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگا ہے اب پھوڑے کا نام لے کر دھوکا دے رہا ہے"

"دشمن کو —— ؟" فجا نے قہقہہ لگایا "بھلا ہمارے گاؤں میں کون سا رن پڑا تھا جس میں میں نے پیٹھ دکھائی تھی؟"

میر صاحب نے جواب نہیں دیا صرف مضحکہ خیز انداز سے بزدل فجا کو دیکھتے ہوئے چلے گئے اور فجا تیل مالش والے سے کہہ رہا تھا۔

"بے چارے میر صاحب —— مونڈھوں پر خالی ڈھول رکھوا لائے، اندر کا گودا وہیں رہ گیا اللہ میاں کے پاس۔"

ہاں تو بات تھی میر صاحب کے تمغے اور بندوق کی جو ان کو بہادری کے صلے میں سرکار سے ملے ہوئے تھے اور میر صاحب کے مزاج کے انداز کو دیکھتے ہوئے وہ تمغہ اور بندوق دیکھنے والوں کے لئے حیران کن تھی ان کی بہادری کے افسانے سُن کر جب اس تمغے پر نگاہ پڑتی تھی تو دیکھنے والا حیران زدہ رہ جاتا تھا اور پھر میر صاحب کو پورے جلال کے ساتھ تمغے کی تاریخ دُہرانی پڑتی تھی جلال اس لئے آتا تھا کہ لوگ کس قدر جاہل ہیں کہ اتنے بڑے کارنامے بھی نہیں جانتے۔ خیر میر صاحب ڈینگیں تو چھوڑیے تمغے اور بندوق کی اصل کہانی سُن لیجئے، لیکن یقین اسی بات پر کیجیے، جو میر صاحب سنائیں ورنہ میر صاحب کی ابے تبے کے لئے تیار رہیے۔

ہوا یوں کہ ایک مرتبہ گاؤں میں ڈاکو آ گئے۔ گاؤں والے

بڑے پریشان ہوئے، ڈاکوؤں نے مکھیا کے گھر پر چڑھائی کر دی اور ساتھ ہی فائرنگ بھی شروع کر دی مسلح ڈاکوؤں کے سامنے لاٹھی، بلّم کی حقیقت ہی کیا تھی، گولیوں کے سامنے کون ٹک سکتا تھا لہٰذا سب گھروں میں دبک گئے۔ اس برستی آگ میں کیسے باہر نکلا جا سکتا تھا مکھیا چیخ رہا تھا مگر بندوقوں کی دھائیں دھائیں میں اُس کا شور پکار دب چکا اور اگر کسی نے سُنا بھی تھا تو وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔

آخر گاؤں کے مدرسے کے ماسٹر نے ہمت کی اپنی بندوق اُٹھائی اور ایک آدمی ساتھ لے کر چھپتے چھپاتے گولیوں سے بچتے ہوئے اندھیرے میں ایک کوٹھری تک جا پہنچے اور پھر اُنھوں نے ایسی پوزیشن لی کہ وہ باہر ڈاکوؤں کو دیکھ سکتے تھے، لیکن خود اُن کی نظروں سے دُور تھے۔ خوش قسمتی سے سامنے ڈاکوؤں کا سرغنہ ہی کھڑا ہوا گولیاں برسا رہا تھا، ماسٹر نے اللہ کا نام لیا ہاتھ کو تولا اور فائر کر دیا ایک دھماکا اور ایک چیخ ——— اور پھر سناٹا چھا گیا۔

فائرنگ وغیرہ سب بند ہو چکی تھی اسی وقت پولیس پہنچ گئی ڈاکو گرفتار ہو گئے، سرغنہ زخمی اور بے ہوش تھا۔

پولیس کے آتے ہی سب سے پہلے میر صاحب تھانے دار صاحب کے پاس پہنچے اور سلام کر کے اپنے مخصوص ڈینگ مارنے والے انداز سے کہا "صاحب اگر آج میں ہمت نہ کرتا تو سمجھئے سارا گاؤں تباہ ہو گیا ہوتا۔ میں نے ڈاکوؤں کے سردار پر گولی چلا کر گاؤں والوں کی جان و مال کو بچایا ہے، یہ کام ہم جیسے بہادر ہی کر سکتے تھے۔

ماسٹر وغیرہ کھڑے منہ دیکھتے رہ گئے ——— بولتے ہی کیا میر صاحب کی شیخی بگھارنے کی عادت سے واقف تھے۔ لیکن جب کچھ عرصے کے بعد میر صاحب کو انگریزی سرکار سے بہادری کا تمغہ اور ایک بندوق عطا ہوئی تو سب کے مونہہ سے حیرت سے کھُلے کے کھُلے رہ گئے ———!

اور میر صاحب کو تو سمجھئے پشتوں کے لئے بہادری کی سند مل گئی، اب کوئی کیا کھا کر میر صاحب کا مقابلہ کرے گا۔ ●●

خوفناک جزیرہ
سراج انور کا لکھا ہوا ایک عجیب و غریب ناول، ڈرپوک اور کمزور دل کے لوگ اسے نہ
قیمت ۵ روپے
ستاروں کے قیدی
چاند کی دنیا میں دو بچے قید ہو گئے۔ انوکھی کہانی، رات کو پڑھیں تو ڈبل لطف آئے گا۔ ظفر پیامی نے لکھا ہے قیمت ۲ روپے
چڑیوں کی الف لیلیٰ
(چار حصے)
کرشن چندر کی لکھی ہوئی ایک مسلسل کہانی۔ پہلا حرف پڑھ کر آخر تک پڑھے بغیر چین نہیں آتا
قیمت ۳ روپے
گھسیٹا کی بھتنا شاہی
گھسیٹا کو بھوت سمجھ لیا گیا اور پھر لوگ اس سے ڈرتے رہے۔
نئی قسم کی منظوم کہانی۔
قیمت ۶۵ نئے پیسے
سمندر کی شہزادی
مچھلیوں کی شہزادی انسان بن کر دنیا میں آئی
اس کی زبان کاٹ ڈالی گئی
عبرت انگیز کہانی۔
قیمت ۴۴ نئے پیسے
کامیابی کی راہیں
(دو حصے)
حامد اللہ افسر نے بچوں کے لئے کامیابی کی نئی راہیں نکالی ہیں۔ ضرور پڑھئے۔
قیمت ایک روپیہ
جادو کا دروازہ
ہزاروں سال پرانی لاش کے پاس ایک خزانہ کا راز تھا جسے حاصل کرنے والا مر جاتا تھا۔
قیمت صرف ۵۰ نئے پیسے
سات رنگ کی
باتصویر کہانیاں
شیر کا انعام۔ ڈرپوک چوہا ظالم بلی۔ بے وقوف بندر بے وقوف راجہ۔ بیچے دوست لکڑوں کوں
پورا سیٹ ۲ روپے ۸۰ نئے پیسے
شریر لڑکا
ایک لڑکے نے اپنی نوکرانیوں کو زندہ جلا دیا شرارتیں جو مصیبت بن گئیں۔
قیمت ۵۵ نئے پیسے
سرکس کے کھیل
پڑھ کر یہ معلوم ہوگا کہ آپ کسی بہت بڑے سرکس میں تماشے دیکھ رہے ہیں
قیمت صرف ۵۰ نئے پیسے
خونی ڈاکو
خطرناک ڈاکو کی دل ہلا دینے والی کہانی
قیمت ۴۴ نئے پیسے
شیخ چلی کی کہانیاں
بیس کہانیوں پر ایک شیخ چلی کی پوری داستان مکمل سیٹ
قیمت ۴ روپے
بھوتوں کا خزانہ
بھوت سے خزانہ حاصل کرنے کی کہانی جو دل چسپ بھی ہے انوکھی بھی
قیمت ۶۵ نئے پیسے
مانو کے کارنامے
عشرت رحمانی نے بندر کی کہانی لکھی ہے جو مزے دار ہے
۶۵ نئے پیسے
جادو کا ہار
غریب لڑکے نے جادو کے ہار کی مدد سے شہزادی سے شادی کر لی۔ جادو کے بے شمار کرشمے۔ قیمت ۴۴ نئے پیسے
شیر کی بیٹی
ایک ننھی بچی کو شیر اٹھا کر لے آیا اور اپنی بیٹی بنا لیا لڑکی بڑی ہوئی تو مصیبتوں میں پھنس گئی
قیمت ۴۴ نئے پیسے
سونے کی صندوقچی
کرشن چندر کی لکھی ہوئی کہانی جو اس قدر دل چسپ ہے کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ قیمت ۴۵ نئے پیسے
تعلیمی تاش سے کھیلئے
اردو 1-50
اردو انگریزی 1-75
انگریزی 1-50
ہندی 1-75
ہندی انگریزی 1-75
اردو ہندی 1-75
کامیاب ڈکشنریاں
جیمبرز پاکٹ ڈکشنری
اردو، ہندی، انگریزی 3-50
پانیر ڈکشنری
اردو، انگریزی 11-50
پانیر ڈکشنری
انگریزی اردو 15-50
کھلونا ۔۔۔ بک ڈپو ۔۔۔ آصف علی روڈ ۔۔۔ نئی دہلی

گلزار

اُوٹ پٹانگ

کانوں کی اک نگری دیکھی جس میں سارے کانے دیکھے
ایک طرف سے احمق سارے ایک طرف سے سیانے تھے

کانوں کی اس نگری کے سب ریت رواج علیحدہ تھے
روگ علیحدہ بستی میں تھے اور علاج علیحدہ تھے

دو دو کانے مِل کر پورا سپنا دیکھا کرتے تھے
گنگا کے سنگم سے کانے جمنا دیکھا کرتے تھے

چاندنی رات میں چھتری لے کر باہر جایا کرتے تھے
اوس گرے تو کہتے ہیں واں سر پھوٹ جایا کرتے تھے

دریا پُل پر چلتا تھا، پانی میں ریلیں چلتی تھیں
لنگوروں کی دُم پر انگوروں کی بیلیں پکتی تھیں

چھوت کی اِک بیماری پھیلی ایک دفعہ ان کانوں میں
بھوک کے کیڑے سُنتے ہیں نکلے گندم کے دانوں میں

روز کئی کانے بے چارے مرتے تھے بیماری میں
کہتے ہیں راجا سوتا تھا سونے کی الماری میں

گھنٹی باندھ کے چوہے جب بِلّی سے دوڑ لگاتے تھے
پیٹ پہ دونوں ہاتھ بجا کر سب قوّالی گاتے تھے

تب کانی بھینس نے پھول پھلا کر چھیڑا بین کا باجا
اور کالا چشمہ پہن کے سنگھاسن پہ آیا راجا

دُکھ سے چشمے کی دونوں ہی آنکھیں پانی پانی تھیں
دیکھا اس کانے راجا کی دونوں آنکھیں کانی تھیں

جھوٹا ہے جو اندھوں میں کانا راجا ہے، کہتا ہے
جا کر دیکھو کانی نگری، اندھا راجا رہتا ہے

امریکہ کے چیتوں کو مچھلی بہت پسند ہے۔
وہ پانی کی سطح پر اپنی دُموں کو
ہلاتے ہیں تاکہ مچھلی ان کی طرف
متوجہ ہو جائے اور پھر "چپیڑے" سے
مچھلی کو پکڑ لیتے ہیں۔
ہمپشائر میں ایک تالاب کا
پانی جم گیا اور تمام سنہری
خوب صورت مچھلیاں بھی جم کر
برف کا ایک حصہ بن گئیں
لیکن مچھلی پالنے والے نے اس برف
کو پانی کے ٹب میں ڈال کر سنہری
مچھلیوں کو برف سے نجات دلائی۔
تمام وحشی اور جنگلی جانوروں میں
ہاتھی ایک ایسا جانور ہے
جس کو آسانی سے کرتب
سکھائے جا سکتے ہیں۔
ایک شکاری کتے اور
ایک خوبصورت خرگوش
کی دوستی ناممکن سی نظر
آتی ہے لیکن اس تصویر
میں کتا اور خرگوش کبھی
نہ جدا ہونے والے دوست ہیں۔ ان میں بڑی پکی دوستی ہے۔
کتے کے مالک نے اس خرگوش کو جب سے پالا ہے۔ کتے کو بھی اس سے
بہت محبت ہو گئی ہے اور اب وہ ہی خرگوش کو دودھ بھی پلاتا ہے
ایک چیتا ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے
دوڑ سکتا ہے۔ اس تصویر میں
موٹر سائیکل پر سوار چیتے کی رفتار کی
آزمائش کر رہا ہے۔
کینیڈا میں گالف کے شوقین
کھلاڑی جب اپنے کھیل میں
مشغول تھے تو انہیں ریچھوں کی
شرارت کا شکار ہونا پڑا۔ وہ ریچھ گالف کی قیمتی گیندیں مونہہ میں بھر سکتے تھے لے کر
بھاگ گئے۔ ان کھلاڑیوں کے شور و غل کے باوجود انہوں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔
سیڑھی سے اُترتی ہوئی بلی لندن کے ایک
فلیٹ میں رہتی ہے۔ اس کا جب جی چاہے وہ اپنے
اس گھر میں سیڑھی کے ذریعے آ جا سکتی ہے۔ اسے
یہ انتظار نہیں کرنا پڑتا کہ کب دروازہ کھلے۔

اور صدیوں کی طرح بیسویں صدی یورپ میں سُستی سے اینڈتی، بَل کھاتی نہیں آئی، بلکہ کسی شوخ اور شریر بچّے کی طرح اُچھلتی، کُودتی، چھلانگیں مارتی آئی، اور اپنے ساتھ اُمنگوں، آرزوؤں، وَلولوں اور بے قرار تمنّاؤں کا خزانہ لائی۔ کھوج، حرکت اور ایجادیں اِس صدی کی شروعات کے اصل رنگ ہیں۔ ایک فرانسیسی لڑکے ژاکس لارتیز نے ایک دن اپنی خوب صورت آپا جان سے کہا، "ذرا زینے سے چھلانگ لگا کر دکھایئے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرا کیمرہ آپ کی چھلانگ کو قید کر سکتا ہے یا نہیں"! اور اس کی آپا جان اُس زمانے کی دلیری اور جاں بازی دکھانے کو سچ مچ ہی زینے سے کُود پڑیں! ژاکس کے کیمرے نے اُس دَور کے شوق اور وَلولوں کو محفوظ کیا۔ آٹھ برس کی عمر ہی میں وہ اِس کہانی کا کافی حصّہ تصویروں کے رُوپ میں جمع کر چکا تھا۔

بیسویں صدی کے پہلے تیرہ برس یورپ کے لئے نئی نئی باتوں کے، نہ بجھنے والی علم کی پیاس کے، کھوج اور ایجاد کے پیامی تھے۔ ولبر رائٹ فرانسیسیوں کو لے مانز کے مقام پر ہوائی جہاز اُڑا کر خوش کر رہا تھا۔ ایک مال دار برازیلی نے ایک دن پیرس کی ایک سایہ دار سڑک پر اپنا چھوٹا سا ہوائی جہاز اُتار کر بہت سے تماشائی اکٹھے کر لئے۔ دنیا کا پہلا ریڈیو اُن دنوں پچاس روپے میں بک رہا تھا۔ بارنی اولڈ فیلڈ نے اُسی زمانے میں اپنی رَیس کار ۱۳۲ میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑائی۔ ہر طرف ترقی کا سیل اُبل رہا تھا، اُمنگوں کی دُھوپ جگ مگا رہی تھی، وَلولوں کا غبار اُڑ رہا تھا ــــــ لیکن اس کے ساتھ یورپ کا ایکا بھی تمام ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب اس صدی کا چودھواں سال آیا تو جنگ نے نئی نسل کے ستاروں پر کمند ڈالنے کے ارادوں پر اوس ڈال دی۔

ژاکس لارتیز نے اپنی اور اپنے کیمرے کی آنکھوں سے اُس جیالے زمانے کی کہانی پیش کی ہے۔ کہانی پورے زمانے کی ہے اگرچہ کردار زیادہ تر اس کے اپنے گھرانے کے ہیں۔

لارتیز گھرانہ ساحل پر چھٹی منانے گیا تو اس نے اپنے ہاتھوں بنایا ہوا بڑا غبارہ اُڑایا۔ لان پر رکھی ہوئی انگیٹھی گرم ہوا پہنچانے کے لئے تھی کبھی کبھی انگیٹھی سے پہنچنے والی گرم ہوا کی تپش غبارے پر دلکش شوخ رنگ بکھیر دیتی تھی

ژاکس کا بڑا بھائی مارس لارتیز ہوائی جہاز کے پنکھے میں جھانک رہا ہے۔ پورے یورپ کی طرح لارتیز گھرانہ بھی جہازوں کا دیوانہ تھا اور کوئی ہوائی نمائش نہیں چھوڑتا تھا۔ ژاکس نے سب سے پہلے ۱۹۱۰ میں ایک فوجی جہاز میں اُڑان کا مزہ چکھا

پیرس کے قریب کے ایک ہوائی اڈے پر جہاز جوڑ پرے کھُل گیا اور ژاکس نے اس منظر کو محفوظ کر لیا۔ ان دنوں ایسے حادثے آئے دن ہوتے رہتے تھے۔
یہ جہاز زمین سے چند فٹ اوپر ہوا تھا کہ پائلٹ کو ڈر لگنے لگا۔ اس نے جہاز کو اُتارنے کی کوشش کی تو جہاز کے ٹکڑے ہوا میں اُڑنے لگے۔
لیکن وہ خود بچ گیا

لاتیز گھرانے نے درجنوں گلائڈر بنائے اور توڑے۔ یہ گلائڈر
مارس کو زمین سے چند فٹ کی اونچائی پر لے اُڑا ــــ اور پھر ٹوٹنے لگا۔
مارس کے بنائے ہوئے ۳۵ گلائڈروں میں یہ آخری تھا

مارس اپنے بائیسویں گلائڈر سے لٹکا اُڑ رہا ہے۔ ایک دوست پہیوں کو
تھامے ہوئے ہے، دوسرا آگے رسّی پکڑے بھاگ رہا ہے۔ (وہ تصویر
میں نہیں ہے۔) لاتیز کی سب سے لمبی اُڑان ایک منٹ کی تھی

لاتیز گھرانے کو عجیب و غریب کشتیوں کا جنون سا تھا۔ مارس ایک کشتی کو
آزما رہا ہے جس کے تلے کا کام دو پُرانے ربر کے بُوٹ دے رہے ہیں۔ وہ حوض
میں اُتھلی طرف سے چلا اور گہرے پانی میں پہنچ کر ٹانگوں سے پتوار کا کام لینے لگا

مارس کی بنائی ہوئی یہ کشتی تیزی
سے پیڈل مارنے سے چلتی تھی، لیکن اس کا
دوست لوئی احتیاطاً اپنے ساتھ پتوار لینا نہ بھولا
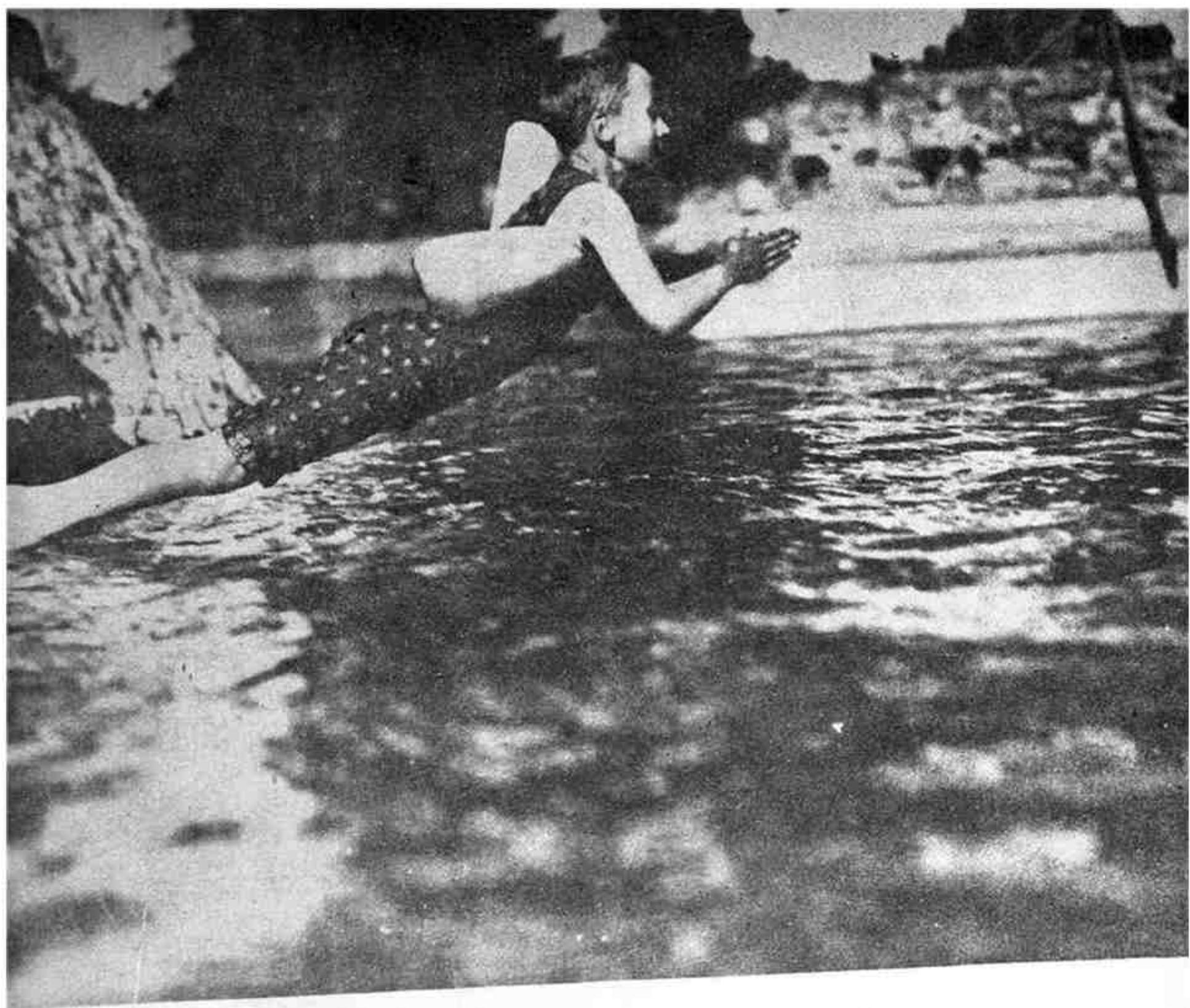
ڈراکس کے بنائے ہوئے پر لگا کر اور اسی کا تیار کیا ہوا نہانے کا لباس پہن کر اس کا چچازاد بھائی پانی میں کود پڑا، تاکہ ڈراکس دیکھ سکے کہ اس کا کیمرہ کودتے ہوئے اس کی تصویر لے سکتا ہے یا نہیں

ڈراکس نے بائیسکل کو کشتی کی "موٹر" بنا دیا — لیکن اس کشتی کو چلانا بڑا تھکا دینے والا کام تھا

ڈراکس کے باپ ہنری نے بجلی سے چلنے والی یہ کشتی بنائی

جب ژاکس کا رشتے کا بھائی
بے ڈھنگے پن سے پانی میں پیچھے کی
طرف کُودا تو ژاکس اس
بے ڈھنگے پن کی تصویر لینے کے لئے
کہیں قریب ہی موجود تھا۔
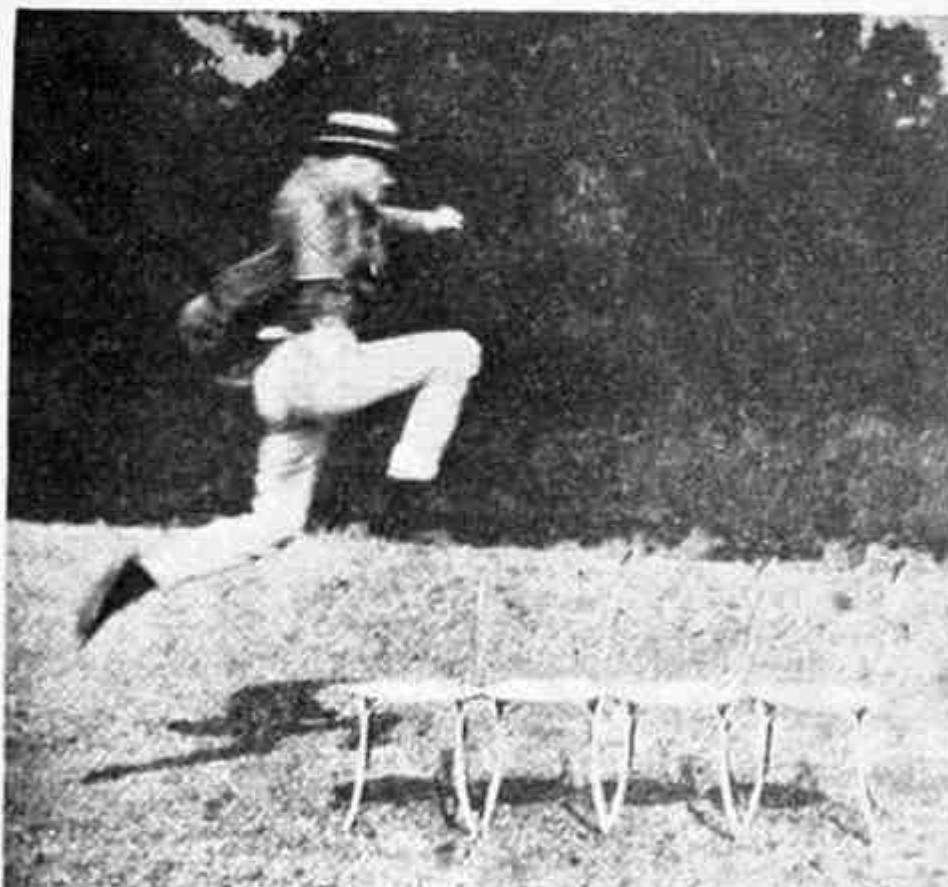
کُرسیوں، میزوں بلکہ
بکری تک کو پھلانگنا ژینیڈ کا پسندیدہ
مشغلہ تھا۔ اس لئے بھی کہ ژاکس اس
کی تصویریں لے سکے

ایک گدھا اور تیز گھرانے کی بنائی ہوئی
ریس گاڑیوں کو پہاڑی کے اوپر لے جاتا تھا۔ چار میل کی
چڑھائی میں آدھا گھنٹہ لگ جاتا تھا۔
اور واپسی اتنی تیزی سے ہوتی تھی کہ گاڑیاں اکثر
اُلٹ بھی جاتی تھیں
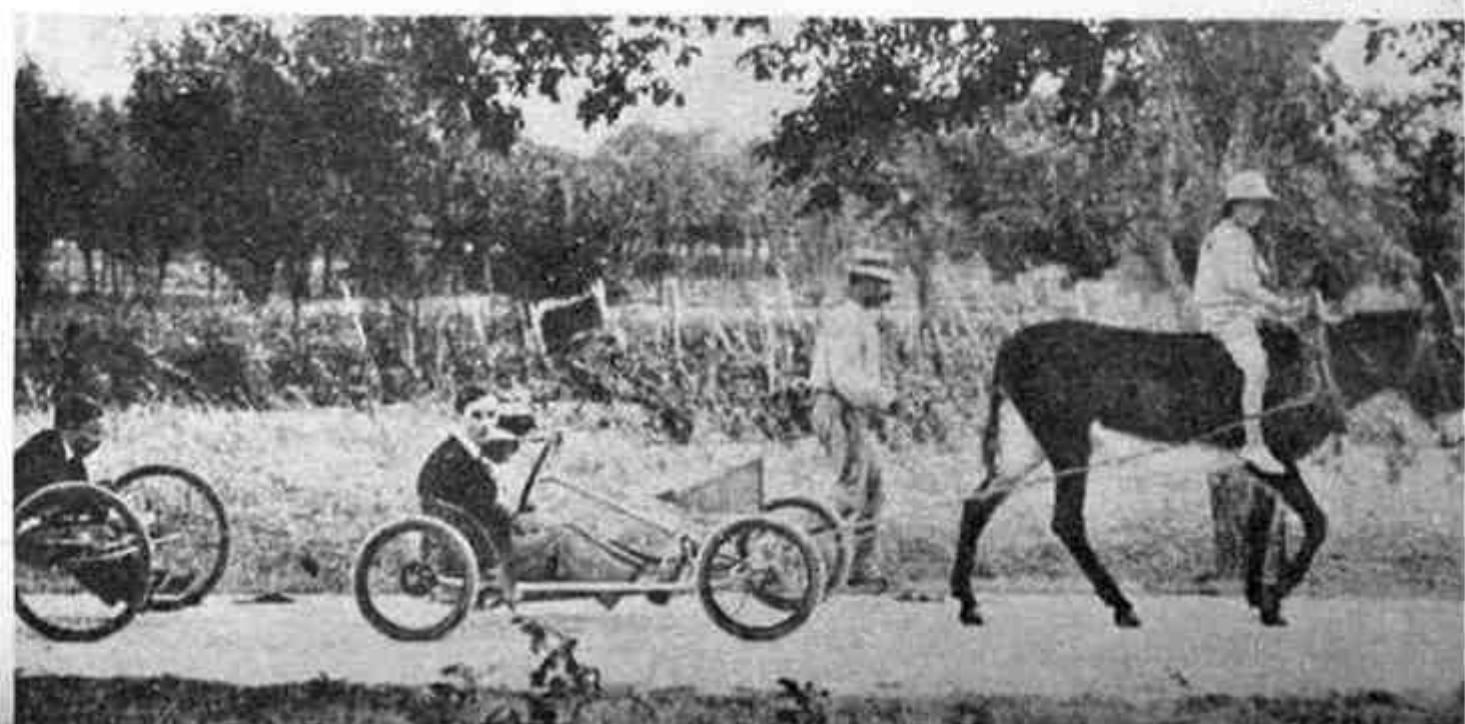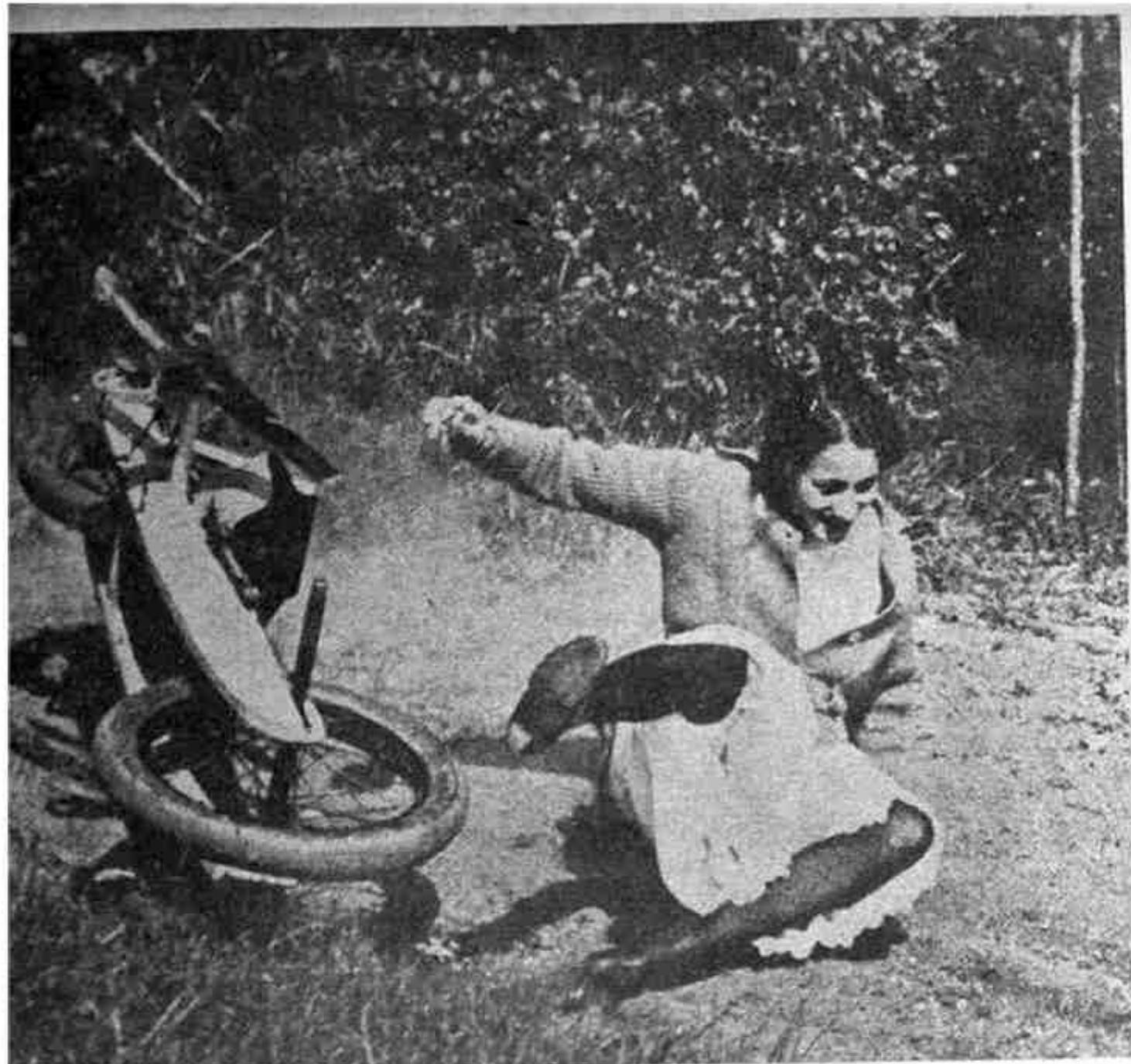
شرم اور بے عزتی کے لمحے بھی زاکس
کے گھرے کی پکڑ میں
آنے سے نہیں بچتے تھے اس لئے
ہیمون روزیل جب لارتیز
گھرانے کے بنائے ہوئے اسکوٹر
سے گری تو اس نے فوراً اپنے چہرے
پر ہنسی کا خول چڑھا لیا

اس تصویر کی وجہ سے
بے چاری مارسیل کا بہت دن تک
لارتیز گھرانے میں
مذاق اُڑایا گیا

۱۹۱۳ میں کار جب ۳۰ میل فی گھنٹے کی
رفتار سے دوڑتی تھی تو اس پر بجلی کا گمان ہوتا تھا۔
اسی لئے زاکس کے باپ کو
عینک کے پیچھے اپنی آنکھیں بند کرنی پڑیں اور ہوا
اُن کی ڈاڑھی میں
آندھی کی طرح غرّاتی تھی
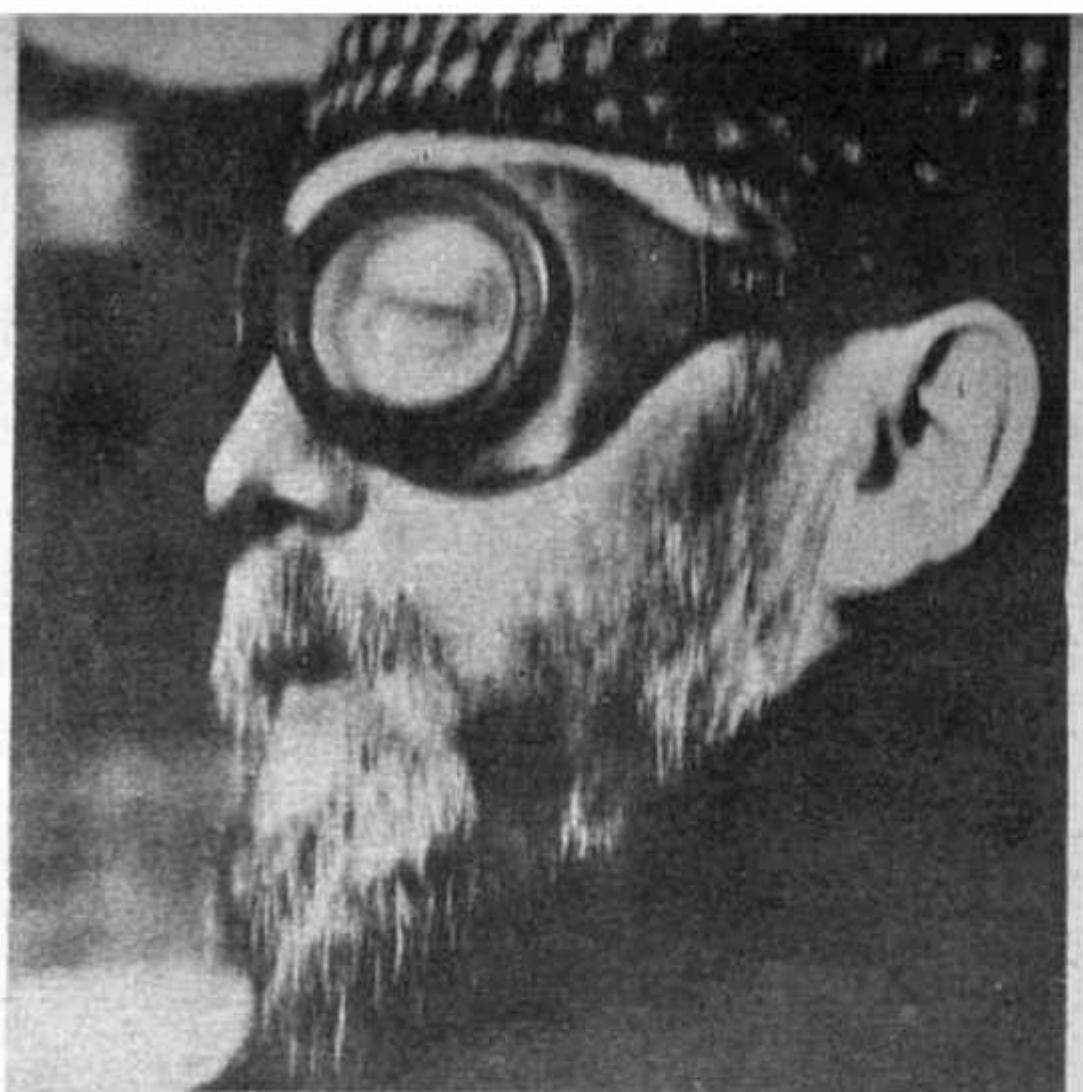
سال بھر بعد
زاکس نے گرانڈ پرکس کی دوڑ
کی تصویریں لیں
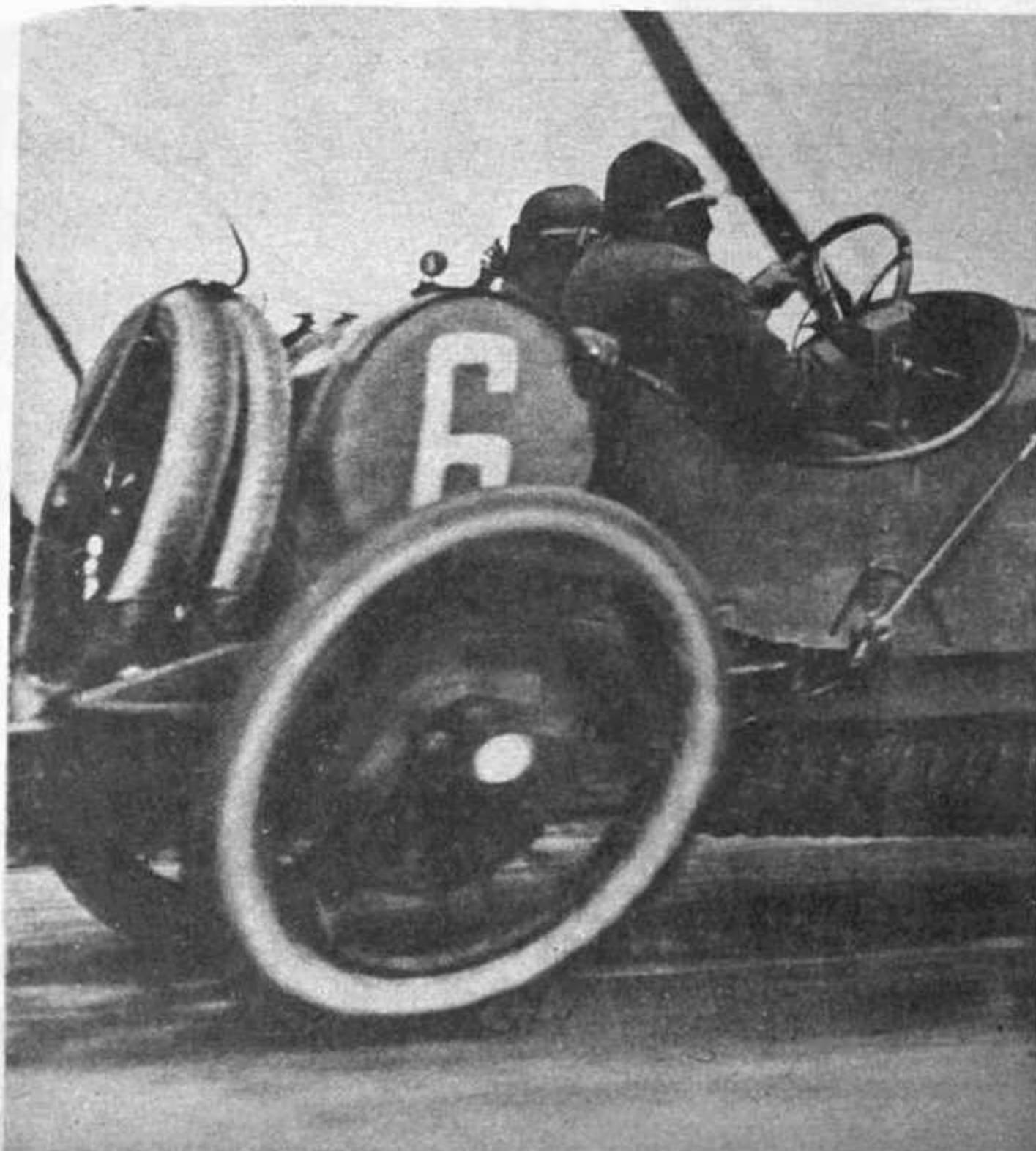
یہ ساری کہانی بچپن کی امنگوں اور ولولوں کی ہے
اب [illegible] کی [illegible]
پہنچی ہے اس نے اس نے کیمرے کو [illegible] دیا ہے
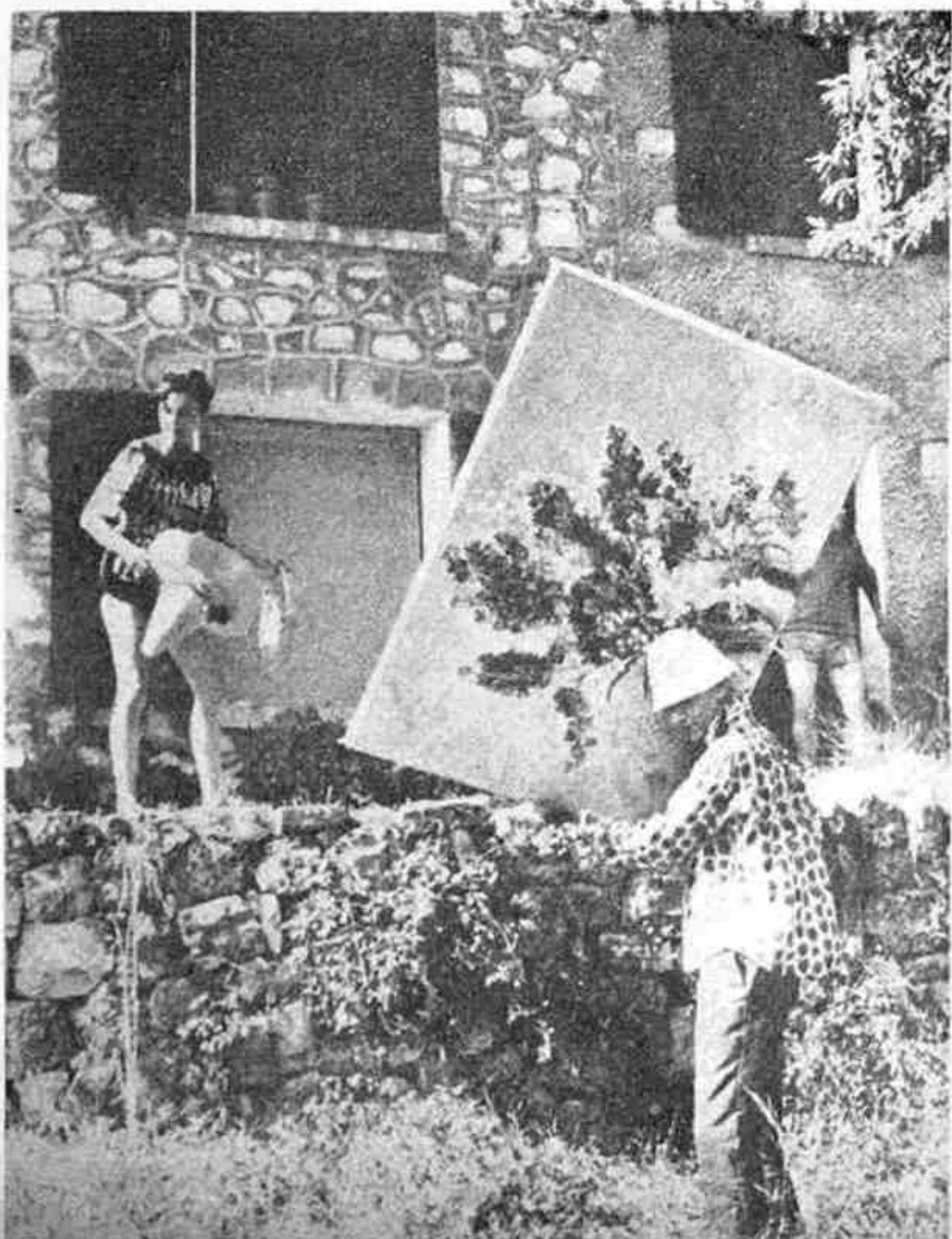
اب وہ رنگوں کی زبان سے
آس پاس کی خوب صورتی کے گیت
گاتا ہے ■ ■

عشرت رحمانی

چالاک دوست

بہت عرصہ گزرا کہ ایک گھنے جنگل میں ایک گیدڑ اور ایک تیتر رہا کرتے تھے۔ دونوں میں بڑی پکّی دوستی تھی۔ اور دونوں ہمیشہ ساتھ رہا کرتے تھے۔ اکٹھے شکار کو جاتے۔ اکٹھے کھانا کھاتے۔ اکٹھے ہی سیر کرتے۔ غرض سب کام مل کر کرتے تیتر بے حد خوب صورت تھا اور ایک درخت کی شاخ پر رہا کرتا تھا۔ اسی درخت کی کھوہ میں گیدڑ رہا کرتا تھا۔ ان دونوں کی دوستی ضرب المثل تھی اور جنگل کے تمام جانور ان کی دوستی پر رشک کرتے تھے۔ تیتر تو بے چارا سیدھا سادھا سا تھا۔ لیکن گیدڑ بڑا چالاک اور حاسد قسم کا تھا۔

ایک دن دونوں دوست باتیں کر رہے تھے۔ گیدڑ بولا۔ "میں جتنا تمھیں چاہتا ہوں اور جو کچھ تمہاری بھلائی کے لئے کرتا ہوں تم اس کا آدھا بھی میرے لئے نہیں کرتے۔ حالانکہ تمھیں اپنی دوستی پر بڑا ناز ہے اور تم ہر جگہ اپنے خلوص اور محبت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہو۔ سچا دوست وہ ہوتا ہے جو اپنے دوست کو جب وہ اُداس ہو تو ہنسائے اور کبھی رُلا بھی دے۔ جب بھوکا ہو تو بہترین قسم کا کھانا کھلائے اور وقت پڑنے دوست کی زندگی بھی بچائے۔ لیکن تم تو صرف باتیں ہی بنانا جانتے ہو تینوں میں سے کوئی بات بھی پوری نہیں کر سکتے۔"

تیتر گیدڑ کی یہ باتیں سنتا رہا۔ جب گیدڑ چپ ہوگیا تو بولا "تم سمجھتے ہو کہ میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔؟ میں تینوں باتیں آج ہی پوری کر کے تمھیں دکھا دوں گا کہ میں صرف ڈینگ نہیں ہانکا کرتا بلکہ میری دوستی واقعی بڑی پکّی اور سچی ہے۔ میں چلتا ہوں تم بھی میرے ساتھ ساتھ چلو۔ اگر میں تمھیں پہلی ہی دفعہ نہ ہنسا سکا تو تم مجھے بے شک چیر پھاڑ کر کے کھا لینا۔" چنانچہ گیدڑ اور تیتر

دونوں چل پڑے۔ گیدڑ زمین پر چل رہا تھا اور تیتر ہوا میں اڑ رہا تھا۔ کچھ دور اُڑنے کے بعد تیتر نے دو مسافروں کو ایک دوسرے کے پیچھے آتے دیکھا۔ دونوں مسافر بے حد تھکے ہوئے تھے اور دونوں کے پانوؤں میں بُری طرح درد ہو رہا تھا۔ آگے والے مسافر کے کندھے پر لکڑیوں کا ایک گٹھا تھا۔ دوسرا مسافر جوتے بغل میں دابے ہوئے چل رہا تھا۔ تیتر نیچے اُترا اور چپکے چپکے پہلے مسافر کے کندھے پر رکھے ہوئے لکڑیوں کے گٹھے پر بیٹھ گیا ہلکا پھلکا تو تھا ہی مسافر کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ تیتر بیٹھ گیا ہے —

لیکن پیچھے والے مسافر نے تیتر کو بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ اور سوچا کہ میں اگر چاہوں تو بڑی آسانی سے اسے مار سکتا ہوں۔ مگر ہم دونوں اسے بھون کر مزے لے لے کر کھائیں گے۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنے جوتے تیتر پر کھینچ مارے تیتر پھُر سے اُڑ گیا جوتا پہلے مسافر کی پگڑی پر زور سے جالگا اور پگڑی گر گئی۔ آگے والا مسافر غضبناک ہو کر بولا "تم کیا کر رہے ہو، تم نے اپنے جوتے میرے سر پر کیوں مارے ؟"

دوسرا بولا "بھائی غصہ نہ کرو۔ میں نے تمھیں نہیں مارا تھا۔ بلکہ میں نے تیتر کے شکار کرنے کے لئے مارا تھا جو تمھارے کاندھے پر بیٹھا تھا۔" "آہا ہا کیا کہنے ہیں تمھارے تیتر میرے گٹھے پر بیٹھا تھا۔ تم نے مجھے اتنا احمق سمجھ رکھا ہے کہ میں تمھاری باتوں میں آجاؤں گا ؟" پہلا مسافر غصہ سے چلّا کر بولا "ایسے جھوٹے قصے نہ گھڑو۔ پہلے تم نے جوتے مار کر میری پگڑی گرادی اور اب جھوٹ بھی بول رہے ہو۔ میں تمھیں ابھی سبق سکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر پہلے مسافر نے جھٹ جاکر دوسرے کا گریبان پکڑا اور پیٹنا شروع کیا وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ایک دوسرے کو مار مار کر لہو لہان کر دیا۔ دونوں کے ناک اور مونھ سے خون بہہ رہا تھا اور کپڑے پھٹ گئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر گیدڑ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ جب ہنسنے کی تاب نہ رہی تو تیتر نے پوچھا "کیوں دوست ! اب تو تم مطمئن ہو نا یا ابھی اُو بھی کچھ دیکھو گے ؟"

گیدڑ نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "بے شک تم نے ہنسانے والی شرط پوری کر دی ہے۔ لیکن تم مجھے رُلانے میں کامیاب نہ ہو سکو گے۔ ہنسا دینا تو بڑا آسان ہے۔ لیکن کسی کو رُلانا بہت مشکل ہے۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، چلو یہ بھی چل کر دیکھ لو۔" تیتر بولا "کچھ شکاری اپنے کتوں کے ساتھ اس طرف چلے آرہے ہیں۔ تم درخت کی کھوہ میں چھپ کر بیٹھ جاؤ اور میرا انتظار کرو۔ اگر صحیح معنوں میں تمھیں نہ رُلا دیا تو میں جان دے دوں گا۔" یہ کہہ کر تیتر اُڑ گیا۔ گیدڑ چھپ کر کھوہ میں بیٹھ گیا اور تیتر کا انتظار کرنے لگا تیتر جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان نیچے نیچے اڑ رہا تھا۔ کتوں نے اسے دیکھ لیا۔ تیتر اس درخت کے پاس آیا جہاں گیدڑ چھپا بیٹھا تھا۔ کتے بھی تیتر کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ اُنھوں نے گیدڑ کی بو سونگھ لی اور بھونکنا شروع کیا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز سُن کر شکاری اس جگہ آئے اور دُم سے پکڑ کر گیدڑ کو باہر کھینچ لیا۔ اب کتوں نے گیدڑ کو بھنبھوڑنا شروع کیا۔ جب یقین ہو گیا کہ گیدڑ مر گیا ہے تو وہ اُسے اسی حالت میں چھوڑ کر آگے چلے گئے۔ لیکن گیدڑ مرا نہیں تھا۔ صرف بہانہ کئے ہوئے پڑا تھا۔ جب شکاری اور کتے چلے گئے تو اُس نے آنکھیں کھولیں اور درخت کی شاخ پر تیتر کو بیٹھے دیکھا۔ تیتر نے پوچھا "کیوں دوست جان تو بچ گئی۔ کہو روئے یا نہیں ؟"

گیدڑ ہانپتے ہوئے بولا "ارے یار ! خوف کے مارے میری تو جان ہوا ہو گئی۔ کم بخت کتوں نے بُری طرح زخمی کر دیا ہے۔ تم جیت گئے ہو۔ لیکن اب مجھے بڑی زور کی بھوک لگ رہی ہے کھانا کھلانے کا انتظام کرو اور اپنی دوستی کا ثبوت دو اگر تم نے مجھے پیٹ بھر کر مزے دار کھانا کھلا دیا تو میں سمجھ جاؤں گا کہ تم میرے سچے دوست ہو ورنہ نہیں۔"

تیتر نے کہا "بہت اچھا! میرے ساتھ چلو۔ جب کہوں تو میری مدد کرو۔" ذرا آگے گئے تو کچھ عورتیں اپنے خاوندوں کے لئے کھیتوں پر کھانا لے کر جا رہی تھیں۔ تیتر درد سے چلاتا ہوا ڈالی ڈالی پھدک رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زخمی ہوگیا ہو۔ "ارے دیکھو! زخمی تیتر۔" ایک عورت زور سے بولی ہم بڑی آسانی سے اُسے پکڑ سکتے ہیں۔ یہ سن کر وہ عورتیں تیتر کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگیں اور تیتر انھیں بھگاتا رہا۔ یہاں تک کہ ان عورتوں نے کھانے کی گٹھریاں اُتار کر ایک جگہ رکھ دیں تاکہ آسانی سے تیتر کو پکڑ سکیں۔ گیدڑ خاموشی سے یہ سب کھیل دیکھ رہا تھا۔ جب کھانا رکھا دیکھا تو وہ چپکے سے گٹھریوں کے قریب آیا اور ایک گٹھری جس میں بہت سے مزے دار کھانے تھے اُٹھا کر بھاگ گیا۔

"کیوں دوست! اب تو تم میری طرف سے مطمئن ہونا؟"

تیتر نے پوچھا۔ "میں نے تمھاری تمام شرطیں پوری کر دی ہیں"

گیدڑ کھاتے ہوئے بولا "میں مانتا ہوں کہ تم نے مجھے بے حد مزے دار کھانا کھلایا۔ جی بھر کر ہنسایا بھی اور تم نے مجھے رُلا بھی دیا۔ لیکن دوستی کی سب سے بڑی شرط پوری نہیں کی۔ یعنی تم نے میری جان نہیں بچائی۔"

تیتر نے کہا "تم شاید ٹھیک کہتے ہو میں ایک حقیر سا جانور ہوں۔ اچھا اب چلو کافی دیر ہوگئی ہے۔ اب ہمیں گھر چلنا چاہئے پل پر سے جانے میں بہت دیر لگے گی۔ اس لئے ہمیں اسی جگہ سے دریا عبور کرنا چاہئے۔ ایک مگرمچھ میرا دوست ہے وہ اپنی پیٹھ پر بٹھا کر ہمیں دریا پار کرا دے گا۔ تیتر اور گیدڑ دریا کے کنارے پہنچے اور مگرمچھ انہیں دریا پار کرانے پر رضامند ہوگیا۔ دونوں مگرمچھ کی پیٹھ پر بیٹھ گئے اور مگرمچھ تیرنے لگا۔ جب بیچ دریا میں پہنچے تو تیتر نے گیدڑ کو ہولے سے کہا "مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ مگرمچھ کی نیت ٹھیک نہیں۔ اگر وہ تمھیں دریا میں گراتا ہے تو تمہاری جان بچنا ناممکن ہو جائے گا۔ گیدڑ کی تو جان ہی نکل گئی لیکن بولا اس طرح "تمہاری جان بھی تو خطرے میں ہے۔"

تیتر نے کہا "نہیں دوست! میرے لئے کوئی پریشانی نہیں۔ میں تو اُڑ جاؤں گا لیکن تم نہ اُڑ سکتے ہو نہ ہی تیر کر جان بچا سکتے ہو۔"

گیدڑ خوف سے کانپنے لگا۔ مگرمچھ اچانک بولا "مجھے بڑی زبردست بھوک لگی ہے۔ میں کچھ کھانا چاہتا ہوں۔"

گیدڑ اس کی پیٹھ پر بیٹھا خوف سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے مونھہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ تیتر فوراً بولا "ہم سے چال چلنے کی کوشش نہ کرو —— میں اُڑ جاؤں گا۔ لیکن میرے دوست گیدڑ ہمیشہ ہوشیار رہتے ہیں۔ جب یہ کسی خطرناک سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو اپنی زندگی گھر کی الماری میں بند کر دیتے ہیں۔"

مگرمچھ نے حیران ہو کر پوچھا "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

تیتر بولا "بے شک! اگر تمھیں یقین نہ ہو تو گیدڑ کو نگلنے کی کوشش کر کے دیکھ لو۔ تھکاوٹ اور پریشانی کے سوا تمھارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔" یہ باتیں **مگرمچھ** کے لئے بے حد عجیب اور حیرت انگیز تھیں۔ وہ اتنا حیرت زدہ تھا کہ راستے میں کچھ نہ بولا اور حفاظت سے دونوں کو دریا کے دوسری طرف پہنچا دیا۔ جب دونوں دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تو تیتر نے پوچھا "دوست! اب تو تمھیں میری دوستی پر یقین آگیا نا۔"

"اچھے دوست پہلے تم نے مجھے ہنسایا، پھر رُلایا۔ اچھا کھانا کھلایا اور اب میری جان بھی بچائی تم سچ مچ بہت ہوشیار ہو۔ لیکن تم جیسے چالاک کو دوست بنانا ٹھیک نہیں۔ پتہ نہیں تم کب مجھے دھوکے سے مروا دو۔ اچھا خدا حافظ۔ گیدڑ نے اتنا کہا اور تیتر کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے بعد پھر کبھی تیتر نے اُسے نہیں دیکھا۔

کہتے ہیں کہ اس دن سے آج تک گیدڑ اور تیتر کبھی ساتھ نہیں ہوتے۔ تیتر گیدڑ کو دیکھ کر اُڑ جاتا ہے اور گیدڑ تیتر کی شکل دور سے دیکھ کر دم دبا کر بھاگتا ہے۔

●●

ذرا ٹھہریئے
کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں،
لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارہ مل سکتا ہے۔
ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسیلیکس" ایک بار، صرف ایک بار
استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے
کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض
ہو جس کے گلے کے غدود (ٹان سلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اِس دوا کے بارے میں ضرور بتلایئے گا
کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب
کر لیتے ہیں اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔ قیمت: تین روپے
SHAMA LABORATORIES
شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں دہلی
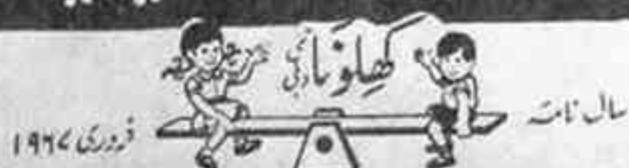
رئیس امروہوی

فارسی اردو سبق

آؤ بچو! سبق پڑھائیں فارسی اور اُردو
"گگائے" "کو بولو گاؤ ہمیشہ "ہرنی" "کو آہو
گھاس گیاہ اور آب ہے پانی اور ندی ہے جُو
منشی جی نے سبق پڑھایا فارسی اور اُردو
ہو ہا، ہو ہا، ہو
ہو ہو ہو ہو ہو ہو

آؤ بچو! سبق پڑھائیں فارسی اور اُردو
آنکھ کو دیدہ، کان کو گوش اور آنکھ کی بھوں ابرو
خال ہے تِل اور گال ہے عارض، چوٹی ہے گیسو
منشی جی نے سبق پڑھایا فارسی اور اُردو
ہو ہا، ہو ہا، ہو
ہو ہو، ہو ہو، ہو

آؤ بچو! سبق پڑھائیں فارسی اور اُردو
بچو، پیر کے معنی بوڑھا، بالا بچہ طفل
رنگ ہے روپ اور ڈیل ہے قامت تنہٗ ہے بازو
منشی جی نے سبق پڑھایا فارسی اور اُردو
ہُو ہا، ہُو ہا، ہُو
ہُو ہُو ہُو ہُو ہُو

آؤ بچو! سبق پڑھائیں فارسی اور اُردو
شب کی اُردو رات ہے بچو دن کی فارسی روز
راہ ہے رستہ جنگل صحرا، ہمت کے معنی شُو
منشی جی نے سبق پڑھایا فارسی اور اُردو
ہُو ہا ہُو ہا، ہُو
ہو ہو ہو ہو ہو

آؤ بچو، سبق پڑھائیں فارسی اور اُردو
تو تو میں میں چھوڑ کے بچو، یاد کرو یہ لفظ
من کے معنی "میں" ہوتے ہیں "تو" کے معنی تُو
منشی جی نے سبق پڑھایا فارسی اور اُردو
ہو ہا، ہو ہا، ہو
ہو ہو ہو ہو ہو

سونے کی گیند - مزے دار لڈو

میرزا ادیب

پہلا منظر

منظر:۔ سٹیج پر ایک اوسط درجے کا کمرہ۔

درمیان میں ایک میز۔ میز کے اِردگرد چند کرسیاں۔ ایک کرسی میں عذرا، دوسری میں فریدہ، اور اس کے سامنے کی کرسی پر تحسین بیٹھا ہے۔

میز کے اوپر ایک ڈبہ پڑا ہے۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے عذرا اپنے منہ میں لڈّو ڈال رہی ہے۔ تحسین کے ہاتھ میں لڈّو دکھائی دے رہا ہے اور فریدہ کا منہ ہل رہا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لڈّو منہ میں ڈال کر کھا رہی ہے۔

فریدہ:۔ (لڈو نگلتے ہوئے) تحسین!

تحسین:۔ کیوں فریدہ!

فریدہ:۔ کھاتے کیوں نہیں۔ ہاتھ میں لڈو پکڑے کیوں بیٹھے ہو۔؟

تحسین:۔ کھالیتا ہوں۔

فریدہ:۔ یہ آخری لڈّو ہے نا!

تحسین:۔ پانچواں ہے۔

عذرا:۔ آخری ہوا نا۔ پانچ پانچ لڈّو ہی تو ملے تھے ہر ایک کو!

تحسین:۔ اچھو باجی!

عذرا:۔ کیا ہے!

تحسین:۔ تم نے سارے کے سارے کھالئے ہیں۔

عذرا:۔ اور کیا کرتی۔ امّی نے رکھنے کے لئے تو نہیں دیئے تھے!

فریدہ:۔ نغمہ نے تو ایک بھی نہیں کھایا ہوگا۔

عذرا:۔ اس کے پاس تو کم ازکم سات روز تک پڑے رہیں گے پھر ہر روز ایک لڈّو کھائے گی

تحسین:۔ اور ہمیں ترسائے گی۔

عذرا:۔ اس کی تو عادت ہے کہ ہمیں دکھا دکھا کر مٹھائی کھائے۔

فریدہ:۔ ہم ہر چیز جھٹ پٹ کھا لیتے ہیں۔ اور پھر وہ ہمیں دکھا دکھا کر کھاتی ہے۔

عذرا امی بھی تو اس سے بڑی خوش ہیں!

فریدہ اور ہمیں کہتی ہیں کہ تم تینوں بھوکے ہو' ندیدے ہو۔ اِدھر چیز ہاتھ میں آئی اور اُدھر پہنچی پیٹ میں۔ کیا مجال جو صبر سے کام لو! توبہ کیا ندیدہ پن ہے۔ چٹورے کہیں کے!

عذرا:۔ لڈو دیتے ہوئے بھی تو امی نے کہا تھا۔ تم لوگ فوراً نگل جاؤ گے اور میری نغمہ کسی طریقے اور قاعدے سے کھائے گی'

فریدہ:۔ ہوں! بڑے طریقے اور سلیقے سے کھاتی ہے۔

تحسین:۔ اور جب کھاتی ہے تو ہمیں مسکرا مسکرا کر بھی دیکھتی جاتی ہے

فریدہ:۔ اور امی کہا کرتی ہیں۔ دیکھو اچھے بچے یوں صبر کے ساتھ چیزیں کھایا کرتے ہیں۔

تحسین:۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ یہ نغمہ کی بچی جہاں اپنی چیز رکھے وہاں سے چپ چاپ اٹھا کر کھا لیا کروں!

فریدہ:۔ توبہ کرو تحسین! بڑی چالاک ہے یہ نغمہ بانو!

عذرا:۔ چالاک تو بڑی ہے ۔ پر کسی دن ایسا سبق دوں گی اِسے کہ یاد رکھے گی ہمیشہ!

تحسین:۔ سبق کیا دو گی اجو باجی!

عذرا:۔ سبق کیا دوں گی ۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں ابھی!

فریدہ:۔ سبق دو گی ۔ خاک بھی نہیں دے سکتیں تم!

عذرا:۔ میں اس سے زیادہ چالاک ہوں!

فریدہ:۔ جانتی ہوں جیسی چالاک ہو تم! اس دن کتنی خوشامد سے کہا تھا اس سے۔ نغمہ پیاری بہن! میرا مونہہ کڑوا ہو گیا ہے۔ تھوڑی سی کھیر تو دے دو۔ اور وہ ہنس پڑی تھی۔

ذرا آہستہ جھونکا دو۔ میں آسمان کو چھونا تو چاہتا ہوں، وہاں جانا نہیں چاہتا۔

تحسین:۔ صرف ہنس پڑی تھی؛ کہا نہیں تھا اس نے۔ میں جانتی ہوں تمہاری مکاری!

فریدہ:۔ اور اجو منہ دیکھتی ہی رہ گئی تھی!

تحسین:۔ یاد ہے باجی!

عذرا:۔ بڑی چالاک بنی پھرتی ہے۔ ابھی میرا ہاتھ نہیں دیکھا اس نے!

فریدہ:۔ تو دکھا دو ہاتھ۔ سوچ کیا رہی ہو!

تحسین:۔ فریدہ! باجی اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی!

عذرا:۔ اگر ایسا چکّر دے دوں کہ وہ حیران پریشان ہو جائے تو پھر کیا کہو گے تحسین!

تحسین:۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اب تک کتنی بار تم نے اور فریدہ نے اسے بنانے کی کوشش کی ہے مگر آج تک وہ کسی دھوکے میں نہیں آئی۔ بلکہ الٹا تمہارا مذاق بنایا جاتا رہا ہے۔

عذرا:۔ سچّی بات یہ ہے کہ میں نے آج تک اسے چکّر دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ورنہ اس کی کیا مجال جو بچ کے نکل جائے۔

فریدہ:۔ عذرا! چھوڑ دیہ بات!

تحسین:۔ ہاں باجی! تم اسے کبھی کبھی اور کبھی نہیں بنا سکتیں۔

عذرا:۔ (غصے سے پاؤں زمین پر مار کر) غلط!

فریدہ:۔ عذرا! خدا کے لئے کمرے کا فرش تو نہ توڑو!

تحسین:۔ باجی ایک بار اور اسی طرح فرش پر پاؤں مارا تو زلزلہ آجائے گا سچ مچ! — دیواریں گر پڑیں گی!

فریدہ:۔ بلکہ چھت بھی گر پڑے گی!

(عذرا سر جھکائے کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے)

تحسین:۔ باجی کو بڑا غصّہ آگیا ہے۔

فریدہ:۔ (ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے) خاموش!

تحسین:۔ کیا ہوا ہے!

فریدہ:۔ سوچ رہی ہے۔ دیکھتے نہیں کس طرح سر جھکا کر چل رہی ہے۔

تحسین:۔ کیا سوچ رہی ہیں۔

فریدہ:۔ میں کیا جانوں!

(عذرا ان کی طرف آتی ہے)

عذرا:۔ نغمہ ہے کہاں!

فریدہ:۔ اپنے کمرے میں ہے اور کہاں ہو گی!

عذرا:۔ اگر آج اس سے پانچوں کے پانچوں لڈّو لے آؤں تو پھر مان جاؤ گے نا!

فریدہ اور تحسین:۔ ہاں!

عذرا:۔ تو رات ہونے دو!

فریدہ:۔ شام تو ہو چکی ہے۔

عذرا:۔ تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ پھر دیکھنا ہوتا کیا ہے۔

تحسین:۔ کیا ہو گا!

عذرا:۔ دیکھ لو گے اپنی آنکھوں کے سامنے!

تحسین:۔ کیا دیکھ لیں گے!

عذرا:۔ یہ نہیں بتاؤں گی ابھی! وہ چکّر چلاؤں گی۔ وہ چکّر چلاؤں گی کہ ہنس ہنس کر تمہارے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔

تحسین:۔ اچھا!

عذرا:۔ اور وہ نغمہ۔ اس بے چاری کا کیا حال ہوگا۔ یہ بھی دیکھ لوگی!

فریدہ:۔ رو پڑے گی!

عذرا:۔ اتنی حیران پریشان ہوگی کہ۔ کہ۔ کہ۔

فریدہ:۔ بس عذرا بس! دیکھتے ہیں کیا کرتی ہو!

عذرا:۔ اگر نغمہ نے اپنی خوشی سے پانچوں لڈو میرے حوالے کر دیئے تو۔

فریدہ:۔ بازار سے پانچ لڈو خرید کر تمہارے حوالے کر دوں گی۔

تحسین:۔ اور میں بھی باجی کو پانچ لڈو دوں گا۔

عذرا:۔ تو اب مجھے اپنا کام کرنے دو۔!

(عذرا جلدی سے کمرے سے نکل جاتی ہے اور پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

منظر:۔ نغمہ کا کمرہ۔

نغمہ کوچ میں دھنسی ہوئی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی ہے۔ کوچ کے پاس ایک تپائی کے اوپر ٹیبل لیمپ روشن ہے۔ اردگرد اندھیرا ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔

نغمہ:۔ (خود سے) پتا نہیں کون ہے۔ (بلند آواز سے) کون ہے؟

آواز:۔ میں ہوں۔

نغمہ:۔ (خود سے) کس کی آواز ہے۔ امّی کی تو نہیں ہے۔ (بلند آواز سے) کون ہو بتاؤ نا!

آواز:۔ میں ہوں۔ ذرا دروازہ کھولو۔

نغمہ:۔ خدا جانے کون ہے۔ خیر۔ دیکھتی ہوں (دروازہ کھول کر) (بلند آواز سے) اچھا۔

(نغمہ کوچ سے اٹھتی ہے۔ دروازے کی طرف

اب تمہارے ناپ کی ٹوپی لے کر آیا تو تم نے بڑی ٹوپی ہی کو کام کا بنالیا!

جاتی ہے۔ دروازہ کھولتی ہے۔ سامنے ہلکے اندھیرے میں شال میں لپٹی ہوئی کوئی بوڑھی عورت دکھائی دیتی ہے۔ صرف اس کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔

نغمہ اسے دیکھتی ہے اور چپ چاپ کھڑی رہتی ہے۔

بوڑھیا:۔ اچھی لڑکی!

نغمہ:۔ جی آپ کون ہیں۔

بوڑھیا:۔ ابھی بتاتی ہوں۔ کیا میں تمہارے کمرے میں آ کر بیٹھ سکتی ہوں۔

نغمہ:۔ کام کیا ہے آپ کو!

بوڑھیا:۔ میں نے سُنا ہے اچھی لڑکیاں مہمانوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتی ہیں۔

نغمہ:۔ امّی کو بلاتی ہوں۔

بوڑھیا:۔ میں تو تمہاری مہمان ہوں۔ تمہاری امّی کی نہیں!

نغمہ:۔ میری مہمان!

بوڑھیا:۔ ہاں اچھی لڑکی!

نغمہ:۔ مگر آپ کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔

اس طرح تمہارا گھوڑا آگے تو نکل جائے گا لیکن تم جیت نہیں سکتے!

بوڑھیا: یہیں دروازے پر بتادوں؟

نغمہ: اچھا تشریف رکھیے۔

(نغمہ پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ بوڑھیا آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے اور کوچ پر ایک کونے میں بیٹھ جاتی ہے۔)

بوڑھیا: کیا پڑھا جا رہا ہے!

نغمہ: امتحان قریب ہے، تیاری کر رہی ہوں۔

بوڑھیا: تم تو ہمیشہ جماعت میں اوّل رہتی ہو۔ شاباش تم پر! اچھی بچیاں اس طرح عزت حاصل کرتی ہیں۔

(نغمہ گھبرا سی جاتی ہے)

گھبراتی کیوں ہو لڑکی!

نغمہ: جی نہیں۔ مگر آپ —

بوڑھیا: اس لئے گھبرا رہی ہو کہ نہیں جانتیں میں کون ہوں۔

نغمہ: جی — کیا عرض کروں۔

بوڑھیا: تمہارا نام کیا ہے! — لیکن میں تو جانتی ہوں تمہارا نام نغمہ ہے۔

نغمہ: آپ میرا نام جانتی ہیں؟

بوڑھیا: کیا تمہارا نام نغمہ نہیں ہے!

نغمہ: یہی نام ہے۔

بوڑھیا: میں پرستان سے آئی ہوں۔

نغمہ: پرستان سے! تو آپ —

بوڑھیا: میں پری ہوں!

نغمہ: آپ پری ہیں — مگر آپ تو بوڑھی ہیں!

بوڑھیا: واہ کیا بات کہی ہے۔ پریاں بوڑھی نہیں ہوتیں۔ ہمیشہ جوان ہی رہتی ہیں۔

نغمہ: مجھے خبر نہیں تھی اس کی!

بوڑھیا: تم نے اپنی کتابوں میں نیلم پری، گل نار پری، الماس پری کی کہانیاں پڑھی ہیں جو اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور انہی میں سے شاید ایک میں بھی ہوں۔

نغمہ: آپ!

بوڑھیا: ہاں نغمہ!

نغمہ: آپ کون ہیں!

بوڑھیا: میں نے بتایا نہیں کہ پرستان سے آئی ہوں۔

نغمہ: آپ پری ہیں — مگر میں نے پوچھا یہ ہے کہ جن پریوں کے آپ نے نام لئے ہیں ان میں آپ کون ہیں!

بوڑھیا: الماس!

نغمہ: الماس کی میں نے کوئی کہانی نہیں پڑھی!

بوڑھیا: اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تم نے کئی پریوں کی کہانیاں نہیں پڑھیں — کسی دن پڑھ لوگی۔ اچھا اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ آج کی رات میں پرستان سے نکل کر تمہارے پاس آئی کیوں ہوں۔ اُف تمہارے ملک میں بڑی سردی ہے۔

نغمہ: ہیٹر لے آؤں دوسرے کمرے سے!

بوڑھیا: کسی کو خواہ مخواہ بے آرام کروگی۔ رہنے دو۔ یہ شال جو اوڑھ رکھی ہے۔ جانتی ہو یہ شال کس کی ہے۔

نغمہ: جی نہیں!

بوڑھیا:- ایک مرتبہ تمہارے ملک کے کسی حصے سے ایک عورت ہمارے ملک میں آگئی تھی۔ پتا نہیں کس طرح آگئی تھی۔ پر آگئی تھی۔ اور میری سہیلی بن گئی تھی۔ یہ شال اس نے مجھے دی تھی۔

نغمہ:- اچھا!

بوڑھیا:- ہمارے پرستان میں تو بالکل سردی نہیں ہوتی۔

نغمہ:- تو آپ آئی کیوں ہیں!

بوڑھیا:- بات یہ ہے نغمہ! پرستان کی ملکہ کو انسانی بچوں سے بڑا پیار ہے۔ خاص طور پر وہ ان بچیوں کو بے حد پسند کرتی ہیں جو بہت اچھی اور نیک ہوتی ہیں۔ خوب محنت کرتی ہیں اور اعزاز حاصل کرتی ہیں! سمجھ لیا نا!

نغمہ:- جی ہاں!

بوڑھیا:- ہماری ملکہ ہر سال کے شروع میں ایسی بچیوں کو پرستان سے کچھ تحفے بھجواتی ہے! — اچھے اچھے تحفے!

نغمہ:- اچھا!

بوڑھیا:- ہاں! — چھ سات پریوں کو چھ سات تحفے دیئے جاتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ جن انسانی بچیوں نے سال بھر میں بڑا نام پیدا کیا ہو انھیں یہ تحفے دے آؤ! مجھے بھی اس مرتبہ ایک تحفہ ملا ہے۔

نغمہ:- ایک تحفہ ملا ہے!

بوڑھیا:- اور وہ تحفہ میں تمہارے لئے لائی ہوں۔

نغمہ:- میرے لئے!

بوڑھیا:- ہاں نغمہ!

نغمہ واقعی!

بوڑھیا:- پریاں کبھی جھوٹ نہیں بولا کرتیں!

نغمہ:- تو آپ کو کس طرح پتا چلا کہ میں امتحان میں اوّل رہتی ہوں۔

پرستان کی بعض پریاں تمہارے ملک میں گھومتی رہتی ہیں

پنجاب کے مسلمان حکمران حسین تکلی شاہ کا ۴۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا تھا، ۴۲ سال تک اس نے صرف خشک روٹی کھائی تھی'۔

اور اچھی بچیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہتی ہیں۔!

نغمہ:- پرستان کی ملکہ نے مجھے تحفہ بھیجا ہے!

بوڑھیا:- اور تحفہ ہے سونے کی ایک گیند!

نغمہ:- سونے کی گیند!

بوڑھیا:- یہ رہی!

(بوڑھیا شال سے اپنا ہاتھ باہر نکالتی ہے۔ اس میں ایک صندوقچہ ہے جو مقفل ہے)

نغمہ:- گیند! — سونے کی گیند۔ واہ وا!

بوڑھیا:- گیند اس کے اندر ہے۔ اور یہ لو چابی!

(بوڑھیا نغمہ کو چابی دے دیتی ہے)

نغمہ:- شکریہ — بہت بہت شکریہ!

بوڑھیا:- میں تمہارا شکریہ اپنی ملکہ تک پہنچا دوں گی۔ اب میں جاتی ہوں۔

نغمہ:- میں نے آپ کی خاطر تواضع تو کچھ کی ہی نہیں!

بوڑھیا:- شکریہ نغمہ! — ایک بات ہے!

نغمہ:- فرمائیے!

بوڑھیا:- پرستان میں بھی ننھی بچیاں ہوتی ہیں جو انسانی بچیوں سے کوئی تحفہ پاکر بے حد خوش ہوتی ہیں۔

نغمہ:- تو میں کیا پیش کروں ـــ اس وقت میرے پاس کچھ ہے نہیں ـــ

بوڑھیا:- پرسوں ایک پری جب واپس پرستان میں گئی تھی تو ایک بچی کی طرف سے کچھ مٹھائی لے گئی تھی۔

نغمہ:- پریاں مٹھائی کھاتی ہیں؟

بوڑھیا:- بہت شوق سے، بڑے مزے سے!

نغمہ:- اچھا تو ـــ میرے پاس اس وقت پانچ لڈو ہیں!

بوڑھیا:- لڈو ـــ سنا ہے یہ مٹھائی بڑی لذیذ ہوتی ہے۔

نغمہ:- میں یہ لڈو دے دوں ننھی پریوں کو۔

بوڑھیا:- میں یہ لڈو ننھی پریوں کو دے دوں گی۔

نغمہ:- تو ٹھہریئے ذرا ـــ ابھی لوٹ کر آتی ہوں!

(نغمہ اندھیرے میں تیزی کے ساتھ کمرے میں سے نکل جاتی ہے۔ بوڑھیا شال درست کرتی ہے۔

(تین چار لمحے گذر جاتے ہیں۔)

نغمہ لوٹ کر آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈبہ ہے۔!

بوڑھیا:- واہ وا ـــ وہ تو خوش ہو جائیں گی!

نغمہ:- خدا کرے ایسا ہو!

(بوڑھیا ڈبہ ہاتھ میں لے لیتی ہے اور اٹھتی ہے)

بوڑھیا:- اب چلتے ہوئے! ـــ وہ گیند دیکھ لو نا!

نغمہ:- اچھا ـــ

نغمہ چابی سے صندوقچہ کھولتی ہے اور اس میں سے ایک عام گیند نکالتی ہے۔

دروازے سے فریدہ اور تحسین ہنستے ہوئے آتے ہیں۔ بوڑھیا شال اتار دیتی ہے ـــ اب وہ عذرا ہے!

(نغمہ اس طرح انہیں دیکھتی ہے جیسے حیران ہو گئی ہے)

عذرا:- (اپنی اصلی آواز میں) کیوں کیسا چکر دیا ہے۔

تحسین:- باجی اجو! آج تمہیں استاد مان لیا ہے میں نے!

فریدہ:- نہیں استادوں کی استاد! عذرا کمال کر دیا ہے تم نے!

نغمہ:- لڈو لینا چاہتی تھیں تو مانگ لیتیں! میں دے دیتی! اس طرح دھوکا کیوں دیا ہے مجھے!

عذرا:- مزا تو اس طرح لینے میں ہے (فتح مندانہ انداز میں) دس لڈو اور ملیں گے مجھے!

تحسین:- نغمہ سونے کی گیند کیسی ہے!

فریدہ:- واہ وا ـــ کیا گیند ہے۔ پرستان سے آئی ہے۔

عذرا:- پرستان کی ملکہ نے بھیجی ہے!

(تینوں زور زور سے قہقہے لگاتے ہیں۔ نغمہ حیران پریشان دکھائی دیتی ہے)

تحسین:- اجو باجی! نکالو لڈو!

فریدہ:- اس کے سامنے کھاتے ہیں!

عذرا:- کیوں نہیں۔

(عذرا ڈبہ کھولتی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے)

فریدہ:- ارے اس میں تو کوئلے ہیں۔

تحسین:- کوئلے!

نغمہ:- (مسکرا کر) آداب عرض ہے جناب! کھائیے لڈو۔ شوق سے کھائیے! نغمہ کو دھوکا دینا آسان نہیں ہے۔ کھائیے لڈو۔ بڑے مزے دار ہیں۔ ہی ہی ہا ہا ہا!

(نغمہ قہقہہ لگاتی ہے۔ تحسین، عذرا اور فریدہ حیران پریشان کھڑے ہیں اور پردہ گر جاتا ہے) ●●

آدمیوں میں کوئی بہت ماہر
دوڑنے والا ہی چار میل فی
منٹ (یعنی پندرہ میل فی گھنٹہ)
کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے، لیکن
ہاتھیوں میں ہر ہاتھی زمین
کو ہلاتا ہوا پچیس میل گھنٹہ کی
رفتار سے لپکا چلا جاتا ہے۔
MILE
جانوروں کی دُنیا کے باکمال کھلاڑی
ہرن اس سے بھی تیز دوڑتا ہے۔ اسے اپنی جان کا اندیشہ ہو تو
بجلی بن جاتا ہے۔ اس وقت انہیں پکڑنے کے لئے جیپ یا
کار کو ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی زیادہ تیز دوڑانا پڑے گا
مختصر فاصلوں کے لئے سب سے تیز رفتار جانور چیتا ہے۔ اس کی رفتار ۷۰
میل فی گھنٹہ تک ہو سکتی ہے۔ مگر صرف چھوٹے فاصلوں کے لئے سو
گز کی دوڑ یہ صرف تین سیکنڈ میں پوری کرے گا، لیکن پانچ میل دوڑ میں
شاید یہ آدمی سے بھی پیچھے رہ جائے!
شتر مُرغ بھی دوڑتے ہیں
عمدہ قسم کے ریس کے گھوڑے
سے بازی لے جاتا ہے۔ اس
کے پر اُڑنے میں تو نہیں دوڑنے
میں اس کی مدد ضرور کرتے ہیں۔
کھلونا
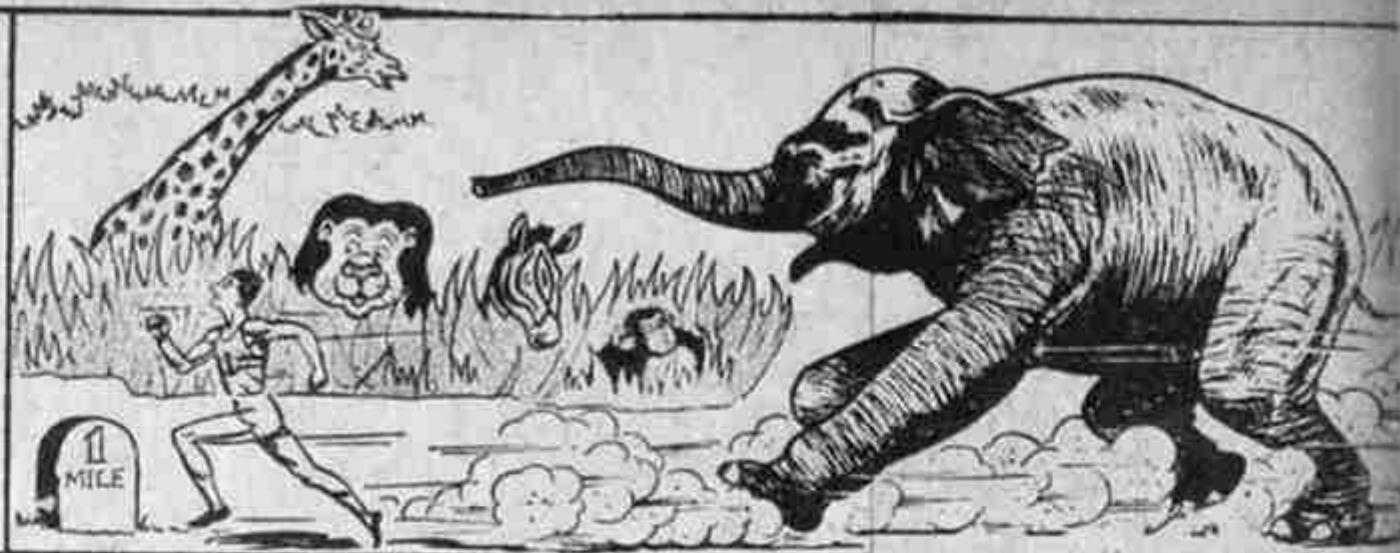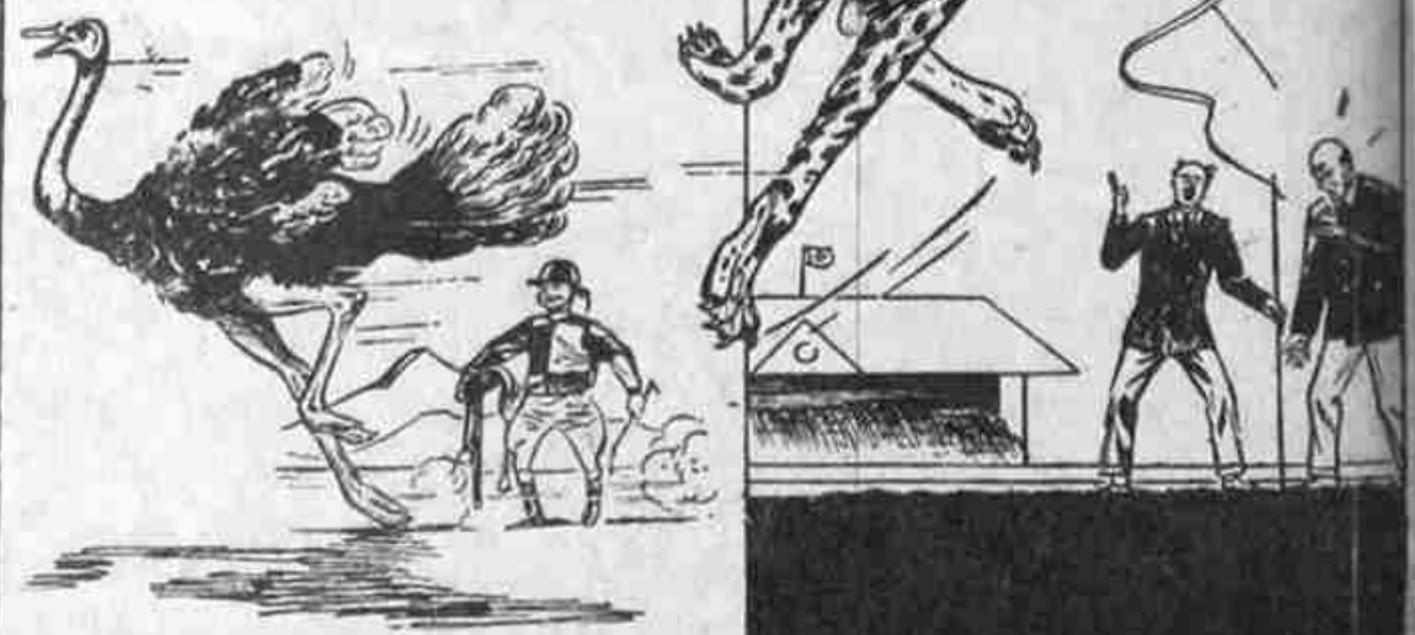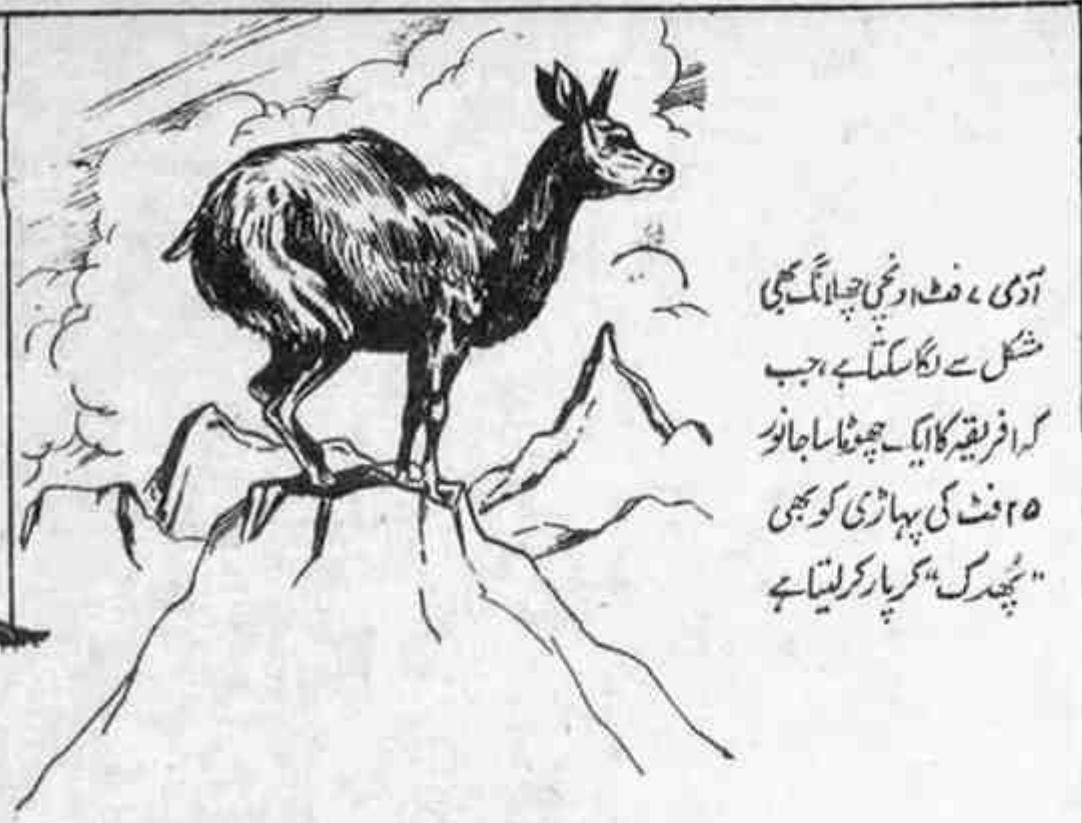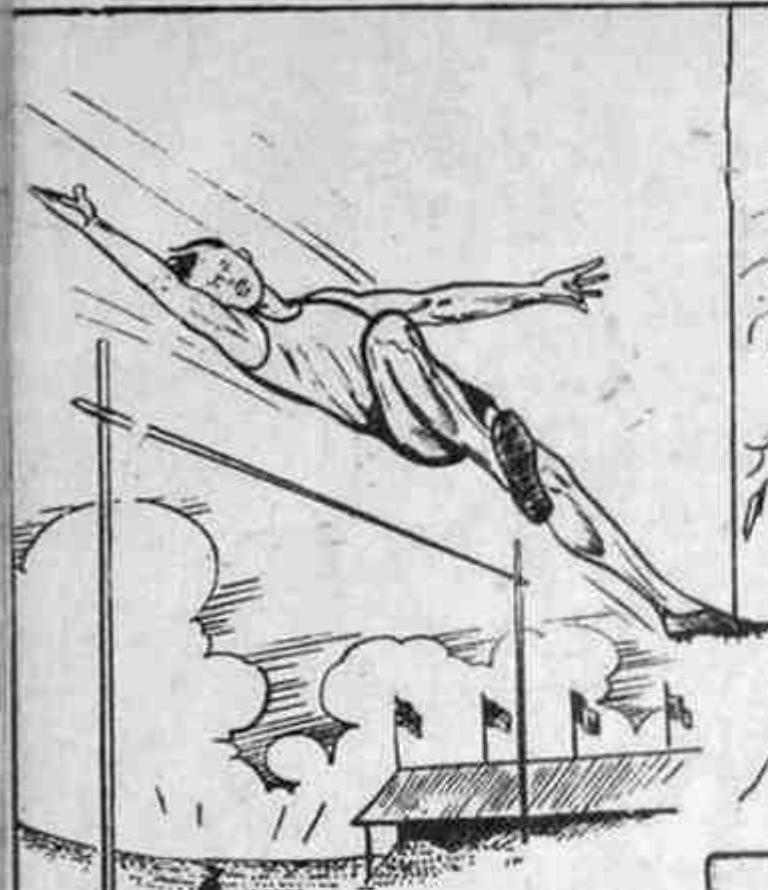
آدمی ۷ فٹ اونچی چھلانگ بھی
مشکل سے لگا سکتا ہے، جب
کہ افریقہ کا ایک چھوٹا سا جانور
۲۵ فٹ کی پہاڑی کو بھی
"پُھدک" کر پار کر لیتا ہے
کنگارو کم از کم جانوروں کے معیار کے مطابق - اونچی چھلانگ کا
ماہر نہیں یہ زیادہ سے زیادہ دس فٹ اونچی چھلانگ لگا سکتا ہے
جانوروں میں لمبی چھلانگ مارنے والوں میں سب
سے عجیب و غریب جیرو با ہے۔ چوہے کی قسم کا یہ چند
انچ کا جانور کھڑے کھڑے ، فٹ کی چھلانگ لگا لیتا ہے
بڑے جانوروں میں لمبی
چھلانگ کا چیمپین امپالا
ہے۔ آدمی کے لئے ۲۵
فٹ لمبی چھلانگ خاصا
اچھا ریکارڈ ہے ، لیکن
امپالا ایک چھلانگ ۴۰
فٹ کی لگا سکتا ہے۔
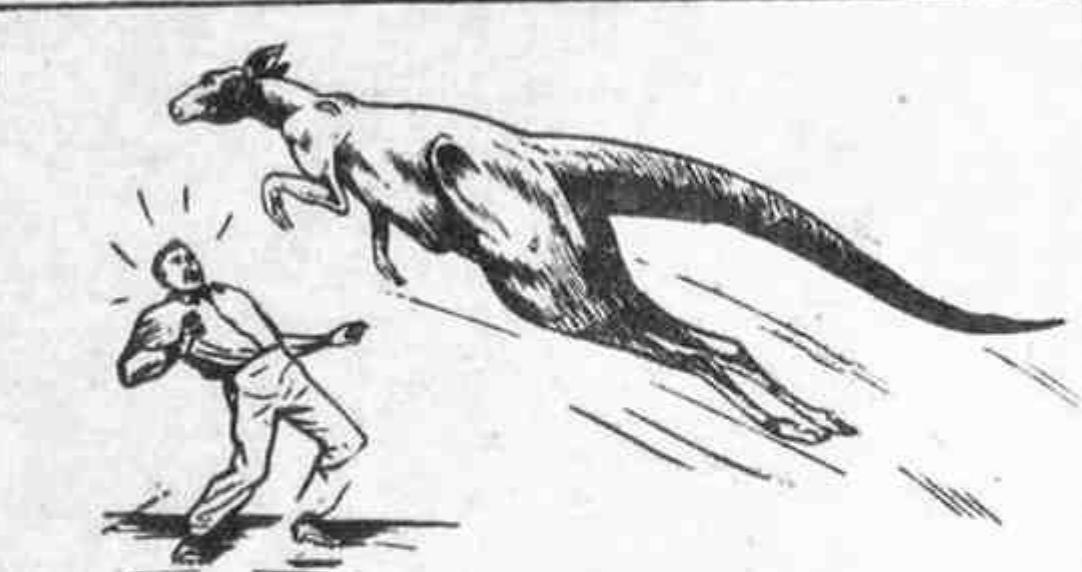
سٹّا اوٹ پٹانگ کی فنیاد
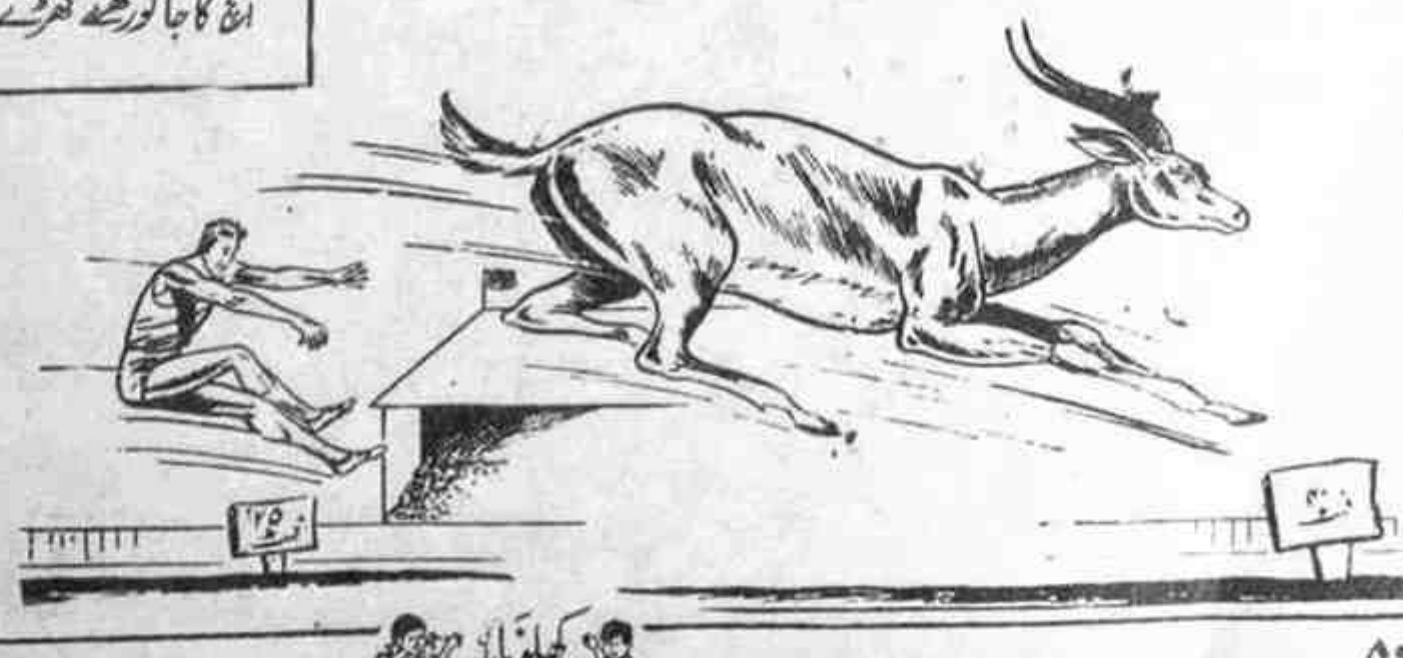
دیکھا تھا رات خواب میں، اسکول بند ہے
سب ساتھیوں کا حوصلہ بے حد بلند ہے
لیکن کھُلی جو آنکھ، حقیقت کچھ اور تھی
اسکول جا رہا ہوں بڑی بے کسی کے ساتھ!

پھر امتحاں قریب ہے، پھر دل میں ہوک ہے
حلوے کی جُستجو ہے، پُلاؤ کی بھُوک ہے
اِس سال بھی پڑھائی کا عالم یہی رہا
جغرافیہ بھی بھُول گیا، ہسٹری کے ساتھ!

کہتے ہیں لوگ مجھ کو بڑا کام چور ہوں
وہ مسئلہ ہوں میں کہ جواب زیرِ غور ہوں
اب دیکھئے کہ ہوتا ہے انجام غور کیا؟
پیچھے پڑے ہیں لوگ، مری زندگی کے ساتھ!

شوکت پردیسی

تاریک مکان

اظہار اثر

گرمی زیادہ تھی اور دوپہر کا وقت تھا، اس لئے "تفریحی پارک" میں صرف اکّا دکّا آدمی ہی نظر آرہے تھے۔ اس کے باوجود تفریحی پارک کا اناؤنسر بار بار مائک پر چلّا چلّا کر ٹرک پر چلتے ہوئے لوگوں کی توجہ اپنی جانب پھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آیئے ادھر آیئے! تفریح کا ایک انوکھا مقام! آپ کی ہمت اور ذہانت کا امتحان ــــــ آیئے ــــــ آیئے اور ہمارا تاریک مکان دیکھئے! تاریک مکان ــــــ دنیا بھر کی تفریحات میں ایک عجوبہ ــــــ ایک حیرت انگیز مکان۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ نے ایسی جگہ کبھی نہیں . . . . . ." وغیرہ وغیرہ۔

تفریحی پارک شہر کے بیچوں بیچ کنور نریندر سنگھ نے بنایا تھا۔ پہلے کنور نریندر سنگھ ایک سرکس چلاتے تھے۔ لیکن آج کل کے دور میں سرکس کا کاروبار ختم ہو رہا تھا، اس لئے کنور صاحب نے میونسپل کارپوریشن سے ایک بے کار جگہ لے کر ایک مستقل تفریحی پارک وہاں قائم کر دیا تھا

پارک میں بچوں بڑوں اور بوڑھوں سب ہی کی تفریح کا سامان جمع کیا گیا تھا۔ جھولے تھے۔ ہنڈولے تھے۔ چکر تھے۔ بھول بھلیاں تھیں۔ نشانہ کی مشق کرنے کے اسٹال تھے۔ غرض ہر وہ تفریح تھی جو اکثر میلوں اور نمائشوں میں ہوتی ہے۔

لیکن ان سب کے ساتھ ایک اضافہ بھی تھا

اور وہ تھا "تاریک مکان"

"تاریک مکان" ایک قسم کی بھول بھلیاں ہی تھیں۔ لکڑی کی دیواروں سے اُس مکان کو اس طرح بنایا گیا تھا کہ مکان کے اندر قطعی اندھیرا رہتا تھا۔ اتنا سخت اندھیرا کہ واقعی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس مکان میں الگ الگ کمرے تھے۔ مثلاً ایک کمرہ "زلزلہ کا کمرہ" تھا۔ ایک طوفانوں کا کمرہ تھا۔ ایک خاموشی کا کمرہ تھا۔ اس طرح بہت سے چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ زلزلے کے کمرے میں فرش ہر وقت ہلتا ڈولتا رہتا تھا اور جب

کوئی شخص اندھیرے میں اس فرش پر قدم رکھتا تھا تو بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زلزلہ آرہا ہو۔ طوفانوں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے خوف ناک آوازیں آتی تھیں، جیسے آندھی چل رہی ہو، بجلی کڑک رہی ہو۔ خاموشی کے کمرے میں بالکل سناٹا رہتا تھا اسی طرح خوف زدہ کر دینے والے بہت سے کمرے تھے۔ اور لطف یہ کہ کسی کمرے میں ذرا سی بھی روشنی نہیں تھی۔

بھول بھلیوں کی طرح ان کمروں میں بھی جانے والے کو اپنا راستہ خود تلاش کرنا ہوتا تھا۔ راستہ بتانے کے لئے جگہ جگہ دیواروں پر سُرخ اور سبز رنگ کے تیر لگے ہوئے تھے، جو کسی کیمیاوی اثر سے صرف اتنے روشن تھے کہ اندھیرے میں آپ صرف تیر کی بتائی ہوئی سمت دیکھ سکتے تھے، اور کچھ نہیں۔

ساجد کی عمر بارہ تیرہ سال کے قریب تھی۔ اس کے والد پولیس انسپکٹر تھے۔ ساجد نویں کلاس میں پڑھتا تھا اور سائنس کا طالب علم تھا۔ اس روز ساجد اپنے والد کے ساتھ تفریحی پارک کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس نے لاؤڈ اسپیکر پر تاریک مکان کا اعلان سُنا تو اپنے والد سے بولا، "ابّو، ہمیں یہ تاریک مکان دکھا دیجئے"۔

انسپکٹر شہاب نے مسکرا کر کہا، "اب تم ننھے بچے نہیں رہے ہو۔ ساجد میاں یہ سب چھوٹے بچّوں کے لئے ہے"۔

"لیکن وہ اعلان کرنے والا تو کہہ رہا ہے کہ یہ ہماری ہمّت اور ذہانت کا امتحان ہے۔ میں نہ بزدل ہوں ابّو جان، اور نہ بیوقوف، آپ آزما کر دیکھ لیجئے"۔

بات معقول تھی، اس لئے انسپکٹر شہاب نے بیٹے کا دل رکھنے کی خاطر مسکرا کر منظوری دے دی اور دونوں چلتے چلتے تفریحی پارک کی جانب مڑ گئے۔

تاریک مکان میں داخل ہونے کا چار آنے کا ٹکٹ تھا۔ جب وہ دونوں ٹکٹ لینے کی کھڑکی کے قریب پہنچے تو انہوں نے

دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا بھاری بھر کم آدمی بھی ٹکٹ لے رہا تھا۔ وہ شخص پسینے میں شرابور تھا جیسے دور سے چل کر آیا ہو۔ اس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا لیکن قیمتی سوٹ تھا اور سر پر ایک پرانی فیلٹ ہیٹ تھی۔ ساجد نے مسکرا کر باپ سے کہا، "دیکھا ابّو جان آپ نے ؟ تاریک مکان صرف بچّوں کے لئے ہی تفریح گاہ نہیں ہے، بلکہ بوڑھوں کے لئے بھی ہے۔"

انسپکٹر شہاب صرف مسکرا کر رہ گئے۔ انہوں نے ٹکٹ لے لیا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی ٹکٹ لے کر مکان کی طرف جا چکا تھا۔ اسی وقت ایک شخص تیز تیز چلتا ہوا آیا اور اس نے بھی تاریک مکان کا ٹکٹ لیا۔ وہ صورت شکل سے آرٹسٹ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے کپڑوں پر کہیں کہیں رنگ کے دھبّے تھے۔ چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی اور بغل میں ایک بڑا سا رنگوں کا ڈبہ لئے ہوئے تھا۔ وہ بھی ٹکٹ لے کر چلا گیا۔ پھر ان کی موجودگی میں ہی ایک نوجوان لڑکی اور ایک بوڑھا آئے اور ٹکٹ لے کر تاریک مکان کے دروازے کی طرف چلے گئے۔ بوڑھا شخص شاید بیمار تھا، وہ لڑکی کا سہارا لئے ہوئے تھا۔ انسپکٹر شہاب حیران تھے کہ اس بڑھاپے میں بڑے میاں کو تاریک مکان دیکھنے کا کیا شوق چرایا ہے، یا آرٹسٹ صاحب کو اندھیرے میں کون سا منظر نظر آنے کی توقع ہے۔

دونوں باپ بیٹے خاموشی سے تاریک مکان کے پہلے حصّے میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک نیم تاریک کمرہ تھا۔ اس کمرے کو درمیان میں تختے کی دیوار لگا کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پہلا حصّہ اندر جانے کا کمرہ تھا اور دوسرا حصّہ باہر آنے کا لیکن اندر جانے والے اور باہر آنے والے ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

جانے والے راستے پر ایک خانوں دار الماری رکھی تھی اور ایک پارک کا ملازم کھڑا تھا۔ وہ اندر جانے والوں کے ہاتھوں کی تمام چیزیں لے کر الماری میں رکھ دیتا تھا اور ایک ٹکٹ دے دیتا تھا تاکہ وہ واپسی پر اپنا سامان لے سکیں۔ اس الماری کے خانے دوسری طرف بھی کھلتے تھے تاکہ دوسری طرف کا ملازم چیزیں واپس کر سکے۔

ساجد نے اپنی کتابیں الماری میں رکھ دیں۔ انسپکٹر شہاب نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر کے آدمی کا فیلٹ ہیٹ اور آرٹسٹ کا بکس بھی الماری میں رکھے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے دوسرے وہ کمرے میں داخل ہوئے، جو دراصل کمرہ نہیں تھا بلکہ راہ داری تھی۔

لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا، "لیڈیز اینڈ جنٹلمین —— تاریک مکان میں سے آپ کو خود جد و جہد کر کے نکلنا ہے۔ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں —— اس مکان میں جگہ جگہ دروازے بنے ہوئے ہیں جو بھول بھلیوں کی طرح آپ کو غلط راستوں پر ڈالتے ہیں تا ایک بھول بھلیوں سے باہر نکلنے کا صرف ایک راستہ ہے۔ اگر آپ کی ہمّت اور ذہانت جواب دے جاتے اور باہر نکلنا چاہیں تو سرخ نشان والے تیروں کو نظر انداز کر دیجئے اور سبز نشان والے تیروں کی سمت چلئے وہ آپ کو باہر نکلنے والے دروازے پر پہنچا دیں گے۔ یہ دروازہ ایک بڑے کمرے میں کھلتا ہے۔ جہاں ہمارا ایک آدمی آپ کی رہنمائی کے لئے موجود ہوگا۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ آپ کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اندر اندھیرے میں آپ جو کچھ سنیں گے اور محسوس کریں گے یہ صرف آپ کے خوف اور ہمارے آوازی نظام کا کرشمہ ہوگا۔ لیجئے اب آگے بڑھئے . . . . ."

ساجد نے اپنے والد کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں آگے بڑھ گئے۔ راہ داری میں اندھیرا تھا۔ لیکن وہ راستے کی دیواریں محسوس کر سکتے تھے۔ آگے ایک دروازہ تھا۔ جیسے ہی وہ اس دروازے کو پار کر کے دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گئے ہیں۔

یہاں اس قدر گہری تاریکی تھی کہ اُسے چھو کر محسوس کیا

جا سکتا تھا۔ اپنا ہاتھ آنکھوں کے سامنے لاکر بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ساجد نے اپنے والد کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر کہا،

"یہاں تو واقعی بہت اندھیرا ہے ابّو جان۔"

"تم ڈر گئے ؟"

"نہیں ابّو جان ــــ" ساجد نے جلدی سے کہا، "لیکن میں نے اتنی گہری تاریکی پہلی بار دیکھی ہے۔"

"تم میرا ہاتھ نہ چھوڑنا۔" انسپکٹر شہاب نے کہا، "اگر ہم جدا ہو گئے تو ملنا مشکل ہو جائے گا۔"

یہ کمرہ چھوٹا سا تھا وہ دیواروں کو ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھے۔ آخر انسپکٹر کو کسی دروازے کا دستہ نظر آیا۔

"یہ رہا دروازہ۔" انسپکٹر شہاب نے کہا، "اب ہم دوسرے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔"

جیسے ہی انہوں نے دوسرے کمرے کے فرش پر قدم رکھا یکایک ساجد کے حلق سے خوف کی چیخ نکل گئی اور وہ اپنے والد سے چمٹ گیا، کیوں کہ یہ زلزلے کا کمرہ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے زمین ان کے پیروں کے نیچے سے نکل رہی ہے۔

انسپکٹر شہاب نے گہرا سا سانس لے کر خود کو سنبھالا اور ساجد کا شانہ تھپتھپا کر بولے، "ڈرو نہیں ــــ یہ صرف ٹرِک ہے۔ کسی مشین کے ذریعہ کمرے کا لکڑی کا فرش ہل رہا ہے۔"

"یہ بالکل اچانک تھا۔" ساجد نے شرمندگی کے لہجہ میں کہا۔ ویسے میں خوف زدہ نہیں ہوں۔

دیواروں پر سرخ اور سبز تیروں کے نشان تھے ــــ وہ تیروں کے نشان دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔

اس کے بعد دوسرا کمرہ تھا۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ طوفان میں گھر گئے ہوں۔ دھماکے، کڑکڑ ــــ زنّاٹا ــــ غرض عجیب عجیب قسم کی خوف ناک آوازیں تھیں۔ ساجد کو اب اس مصنوعی مہم میں لطف آنے لگا تھا۔
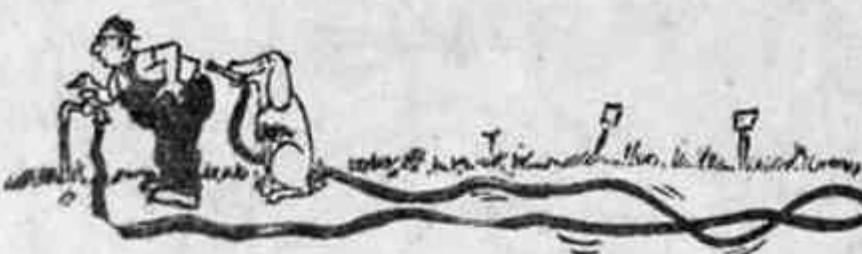
کتے کی شرارت !

تھوڑی دیر بعد وہ تیسرے کمرے میں داخل ہوئے! اس کمرے میں تقریباً سنّاٹا تھا۔ اندھیرے میں دیواروں کے سہارے چلتے ہوئے ان کو اندازہ ہوا کہ یہ کمرہ نہیں تھا بلکہ ایک طرح کی راہ داری تھی۔

یکایک ساجد کا پاؤں پھسلا اور وہ لکڑی کے فرش پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ سے اپنے والد کا ہاتھ بھی چھوٹ گیا۔

"ابّو میں گر گیا ہوں۔" ساجد نے کہا، "ذرا مجھے سہارا دیجئے۔ یہاں کوئی گیلی گیلی چیز پڑی ہے جس سے میرا ہاتھ خراب ہو گیا ہے۔"

انسپکٹر شہاب نے ساجد کو اندھیرے میں ٹٹول کر سہارا دیا اور حیرت سے بولے، "گیلی چیز یہاں کیا ہوگی ؟

"خبر نہیں، کچھ عجیب گاڑھی گاڑھی اور چپچپی سی چیز ہے۔"

انسپکٹر نے فوراً جیب سے پنسل ٹارچ نکالی اور روشنی کا مختصر سا دائرہ ساجد کے ہاتھ پر ڈالا ــــ ساجد کی پوری ہتھیلی پر سرخ رنگ کی کوئی سیال شے لگی ہوئی تھی۔ انسپکٹر شہاب نے اس کے ہاتھ کو سونگھا۔

اچانک انسپکٹر شہاب کے چہرے پر سختی کے آثار پیدا

ہوئے۔ انہوں نے فوراً ٹارچ کی روشنی اِدھراُدھر ڈالی۔ ان کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ وہ اس وقت راہ داری میں تھے اور ان کے سامنے کوئی ایک فٹ کے فاصلے پر ہی ایک دروازہ تھا۔ اسی دروازہ کے نیچے سے وہ سرخ رنگ کی شے رس رس کر راہ داری میں آرہی تھی اور فرش پر کافی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ غالباً اسی پر ساجد کا پاؤں پھسلا تھا۔

انسپکٹر نے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ اگرچہ بند نہیں تھا، لیکن وہ کھلا نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دوسری طرف سے بھی دروازے کو کوئی دھکیل رہا ہے۔ انسپکٹر نے پوری قوت سے دھکا مارا۔ دوسری طرف کوئی بھاری چیز فرش پر گری اور دروازہ کھُل گیا۔

انسپکٹر شہاب نے دوسری جانب ٹارچ کی روشنی ڈالی اور ساجد کے حلق سے حیرت اور خوف کی ایک چیخ نکل گئی۔

دوسری جانب فرش پر ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ اس کے کوٹ کی پشت پر گولیوں کے چار سوراخ تھے، جن سے خون رس رس کر فرش تک پہنچ رہا تھا۔ گولیوں کے نشان زیادہ سے زیادہ دو انچ کے دائرے میں تھے۔

"قتل ـــــ!" ساجد نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا، "ابّو اس کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔"

"ہاں" انسپکٹر شہاب نے کہا، "تم لاش کی طرف نہ دیکھو اور باہر ہی رہو۔"

"نہیں ابّو ـــــ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میں خوف زدہ نہیں ہوں، ارے ـــــ یہ تو وہی شخص معلوم ہوتا ہے جو ہم سے آگے آگے تھا۔"

انسپکٹر نے لاش کے قریب جا کر چہرہ دیکھا ـــــ واقعی یہ وہی ادھیڑ عمر کا شخص تھا جس نے ڈھیلا ڈھالا سوٹ پہن رکھا تھا اور جس کے سر پر پرانی فیلٹ ہیٹ تھی۔ انسپکٹر نے ٹارچ کی روشنی اِدھراُدھر ڈالی۔ کمرے کی ایک دیوار میں شیشہ لگا ہوا تھا جس پر سیاہ رنگ پھرا ہوا تھا تاکہ روشنی اندر نہ آسکے۔ انسپکٹر نے فوراً جیب سے اپنا پستول نکال کر شیشہ توڑ دیا اور باہر جھانکا۔ تھوڑی سی روشنی اندر داخل ہوئی۔ یہ کھڑکی باہر کی جانب کھلتی تھی۔ یہاں سے ٹکٹ فروخت کرنے والی کھڑکی بالکل سامنے تھی۔ دو تین شخص وہاں کھڑے تھے۔ کنور نریندر سنگھ بھی وہیں کھڑا تھا۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز سن کر وہ سب چونک پڑے۔ کنور نریندر سنگھ نے غصے سے کچھ کہنا چاہا، لیکن انسپکٹر شہاب نے اس کی بات کاٹ کر کہا، "کنور صاحب کیا ابھی چند منٹ میں کوئی شخص تاریک مکان سے باہر نکلا ہے؟"

"نہیں ـــــ" کنور نے جواب دیا۔

"بس تو ابھی کسی کو باہر نہ نکلنے دینا اور براہ کرم ذرا پولیس اسٹیشن کو فون کر دیں۔ یہاں اندر ایک قتل ہو گیا ہے۔"

"قتل!" کنور کی آنکھیں پھیل گئیں اور مونھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں قتل۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔ "ذرا جلدی کیجئے اور کسی کو باہر نہ جانے دیجئے۔"

ایسا محسوس ہوا جیسے کنور بے ہوش ہو کر گر پڑے گا لیکن پھر فوراً ہی وہ سنبھل کر فون کرنے کے لئے دفتر کی طرف بھاگا چلا گیا۔

"تاریک ـــــ مکان" میں کل آٹھ آدمی تھے۔

ایک نوجوان لڑکی اور ایک بوڑھا شخص۔ بوڑھا شخص ابھی تک لڑکی کا سہارا لئے ہوئے تھا۔

ایک ادھیڑ عمر کی عورت ـــــ ایک وہی فرنچ کٹ داڑھی والا آرٹسٹ۔

ایک نوجوان نیا شادی شدہ جوڑا۔

اور خود انسپکٹر شہاب اور ساجد۔

پولیس آچکی تھی۔ تاریک مکان میں جتنے لوگ تھے سب ایک کمرے میں جمع تھے۔ سارے مکان میں بڑی بڑی سرچ لائٹیں لگا کر تلاشی جاری تھی۔ پولیس کا ڈاکٹر لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ سب لوگ خوف زدہ تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے لاش کو دیکھ رہے تھے۔

"قاتل ان ہی چھ افراد میں سے ایک ہے۔" انسپکٹر شہاب نے کہا۔ "کیوں کہ مقتول کے اندر داخل ہونے کے بعد کوئی شخص تاریک مکان سے باہر نہیں نکلا۔"

ڈیوٹی پر موجود پولیس انسپکٹر نے لاش کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ کوٹ کے اُوپر والی جیب سے ایک چھوٹا سا کاغذ ملا۔ اس نے وہ کاغذ انسپکٹر شہاب کی جانب بڑھا دیا۔ انسپکٹر شہاب نے کاغذ لے لیا۔ اس پر جلدی جلدی میں چند لائنیں لکھی ہوئی تھیں۔

ڈیر! آج دوپہر کو ڈھائی بجے مجھے نگری پارک کے تاریک مکان میں ملو ــــ پرتاپ مشکوک ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں انتظار کروں گی۔

بملا

انسپکٹر شہاب نے پرچہ پڑھنے کے بعد ان چھ افراد پر ایک نظر ڈالی جو تاریک مکان میں تفریح کرنے آئے تھے پھر وہ ادھیڑ عمر کی عورت کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور اس سے پوچھنے لگے، "تمہارا نام بملا ہے؟"

"نہیں" عورت نے خوف سے ہکلاتے ہوئے کہا، "میرا نام تو کرشنا ہے۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو ــــ تمہارا نام بملا ہے۔ تم مقتول سے ملنے یہاں آئی تھیں۔ یہ تمہارا لکھا ہوا خط ہے۔"

خط دیکھ کر عورت کانپنے لگی اور دونوں ہاتھوں سے مونہہ چھپا کر رونے لگی۔

مجھ پر رحم کیجئے ــــ میں بال بچّوں والا ریچھ ہوں۔ یہ اُن کی تصویر ہے!

نوجوان لڑکی، جو بوڑھے کے ساتھ تھی کہنے لگی، "یہ تو ڈاکٹر مدن معلوم ہوتے ہیں ــــ آنکھوں کے امراض کے ماہر۔"

انسپکٹر شہاب نے تیزی سے لڑکی کی جانب پلٹ کر کہا، "تم مقتول کو جانتی ہو ــــ؟"

"ہاں ــــ انہوں نے چھ مہینے پہلے میرے ڈیڈی کی آنکھوں کا آپریشن کیا تھا۔" لڑکی نے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہارا نام؟" انسپکٹر نے لڑکی سے سوال کیا۔

"انسپکٹر صاحب میرا نام جگدیش ہے اور یہ میری لڑکی نیلما ہے۔"

"آپ مقتول کو پہچانتے ہیں؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔

جگدیش نے ہنس کر کہا، "میں کسی کو نہیں پہچانتا، کیوں کہ میں تو اندھا ہوں۔ ڈاکٹر مدن نے میری آنکھوں کا آپریشن کیا تھا، لیکن میری آنکھیں نہ بچ سکیں۔"

ڈیوٹی والے پولیس آفیسر انسپکٹر شرما نے کہا، "اس کا مطلب ہے آپ کے دل میں بھی ڈاکٹر کی جانب سے غصہ تھا، کیوں کہ اس نے آپ کی بینائی لے لی تھی۔"

"مجھے کوئی غصہ نہیں تھا۔" جگدیش نے پر سکون لہجہ

میں کہا۔ قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔"

اسی وقت ایک سپاہی اندر داخل ہوا اور اس نے ایک پستول انسپکٹر شرما کو دیتے ہوئے کہا، "یہ برابر والے کمرے میں پڑا تھا۔"

پستول میں کوئی گولی نہیں تھی، اور اس کی نال سے بارود کی بُو آ رہی تھی۔

"اسی پستول سے قتل ہوا ہے۔" انسپکٹر شرما نے سر ہلاتے ہوئے کہا، "کچھ اور نہیں ملا؟"

"اور کچھ نہیں ملا سر ——— ہم نے سارے مکان کی تلاشی لے لی۔"

انسپکٹر شرما صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

انسپکٹر شہاب نے پستول لے کر دیکھتے ہوئے کہا، "قاتل نے گولی یقیناً مقتول کی پشت پر پستول کی نال رکھ کر چلائی ہوگی۔"

جو ڈاکٹر لاش کا معائنہ کر رہا تھا اس نے اُٹھتے ہوئے کہا، "جی نہیں۔ میرا خیال ہے گولی کم از کم دس بارہ فٹ کے فاصلے سے چلائی گئی ہے، کیوں کہ کپڑے پر بارود کے نشانات نہیں ہیں۔"

"یہ ناممکن ہے" انسپکٹر شہاب نے کہا، "اتنی گہری تاریکی میں بارہ فٹ کے فاصلے سے اتنا صحیح نشانہ کیسے لگ سکتا تھا کہ چاروں گولیاں صرف دو انچ کے حلقہ میں نشانہ پر لگیں ——— ؟ اس کے علاوہ قاتل کو اندھیرے میں یہ کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ جس پر وہ گولی چلا رہا ہے کون ہے؟"

"کچھ بھی ہو ———" ڈاکٹر نے شانوں کو جنبش دے کر کہا، "گولی دس بارہ فٹ کے فاصلے سے چلی ہے۔"

انسپکٹر شہاب نے کچھ سوچ کر کہا، "اس صورت میں انسپکٹر شرما ایک بار پھر سپاہیوں سے کہیے کہ وہ سارے مکان میں روشنی کی کوئی چیز تلاش کریں۔ کوئی ٹارچ یا ماچس کی جلی ہوئی تیلی وغیرہ اگر گولی بارہ فٹ کے فاصلے سے چلی ہے تو قاتل کے پاس روشنی دینے والی ضرور کوئی چیز ہوگی تاکہ وہ اندھیرے میں مقتول کو پہچان سکے اور نشانے پر گولی لگا سکے۔"

انسپکٹر شرما نے دوبارہ ہدایات جاری کر دیں اور ایک بار پھر تلاشی شروع ہو گئی۔

انسپکٹر شہاب پھر اس ادھیڑ عمر عورت کی جانب مڑے، وہ ابھی تک سسکیاں لے رہی تھی۔

"تم نے بتایا نہیں ——— کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

عورت نے آنسو پونچھتے ہوئے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا، "ہاں ——— میرا نام بملا ہے ——— اور میں یہاں ڈاکٹر مدن سے ملنے آئی تھی۔ لیکن میں ان کو خطرے سے آگاہ کرنے آئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ پرتاپ آج ضرور کچھ کر ڈالے گا۔"

"پرتاپ کون؟"

"میرا شوہر ——— اس نے مجھ سے زبردستی یہ خط لکھوایا تھا۔ وہ ڈاکٹر مدن سے جلتا تھا۔ اسی لئے میں یہاں آئی تھی تاکہ میں ڈاکٹر مدن کو خطرہ سے آگاہ کر سکوں۔ مجھے اپنے شوہر کی حرکتیں پسند نہیں۔ ڈاکٹر مدن ہمارے پڑوسی تھے میرا شوہر اُن سے روپے مانگتا رہتا تھا۔ ایک بار ڈاکٹر مدن کے انکار کرنے پر اُس نے ڈاکٹر کو قتل کی دھمکی بھی دی تھی۔"

"اوہ ———" انسپکٹر شرما نے کہا، "اس کا مطلب ہے تمہارے شوہر پرتاپ ہی نے ڈاکٹر مدن کو قتل کیا ہے۔"

"ہاں۔ لیکن وہ یہاں کہیں بھی نہیں ہے۔" بملا نے جواب دیا، "میں نے اس کو تاریک مکان میں داخل ہوتے بھی نہیں دیکھا۔"

"ہو سکتا ہے وہ بہت پہلے سے اندر آ کر چھپ گیا ہو۔" انسپکٹر شہاب نے کہا۔

"لیکن ڈاکٹر مدن کے اندر داخل ہونے کے بعد کوئی شخص اس مکان سے باہر نہیں نکلا۔"

"بہرحال اگر قتل پرتاپ نے کیا ہے تو وہ یہاں نہیں ہے۔" مسز بملا کیا تمہیں یقین ہے کہ ان چھ افراد میں سے کوئی تمہارا شوہر نہیں ہے۔"

"یقیناً نہیں ہے۔" بملا نے کہا۔

"پھر قاتل کیسے غائب ہوگیا؟" انسپکٹر شرما نے کہا۔

"ہوسکتا ہے قاتل پرتاپ نہ ہو۔" انسپکٹر شہاب نے کہا، "ممکن ہے ان ہی افراد میں سے کسی کو ڈاکٹر سے دشمنی ہو اور اس نے قتل کر دیا ہو۔ بہرحال یہ مجھے یقین ہے کہ قاتل ان چھ افراد میں سے ہی کوئی ایک ہے۔ انسپکٹر شرما ذرا آپ ان کی تلاشی لیجئے اور دیکھئے کہ کیا ان میں سے کسی کے پاس ماچس یا ٹارچ وغیرہ ہے، سگریٹ لائٹر سے بھی روشنی کا کام لیا جا سکتا ہے۔"

انسپکٹر شرما نے سب کی تلاشی لی، لیکن کسی کے پاس کوئی مشتبہ چیز نہ نکلی۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہی ایک سب انسپکٹر نے آکر رپورٹ دی۔

"ہم نے ایک ایک انچ حصہ مکان کا دیکھ ڈالا، کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے روشنی کی گئی ہو۔"

انسپکٹر شہاب نے پریشانی کے انداز میں اپنی ٹھوڑی ملتے ہوئے کہا، "پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قاتل نے ایسی تاریکی میں مقتول کو پہچانا کیسے اور کس طرح بارہ فٹ کے فاصلے پر ایسا صحیح نشانہ لگایا۔"

یہ واقعی معمہ تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ حیران تھا کہ اندھیرے میں قاتل نے کس طرح ایسا صحیح نشانہ لگایا اور کس طرح مقتول کو پہچانا، جب کہ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

ساجد ابھی تک خاموش اور حیرت سے سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ اس کا ننھا سا دماغ اس معمہ کو سلجھانے کی کوشش کر

بلی کو کرسی پر سے اٹھانے کا نتیجہ!

رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ بڑا ہو کر وہ بھی اپنے والد کی طرح سراغرساں بنے۔ اندھیرے میں گولی چلانے کا معمہ اس کے دماغ کی گہرائیوں میں مچل رہا تھا۔ یکایک اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر چپکے سے کمرے سے باہر کھسک گیا۔

اب تاریک مکان کے ہر کمرے میں روشنی تھی۔ ساجد راہ داری سے گزرتا ہوا باہر جانے والے دروازے پر آیا۔ بیرونی دروازے سے پہلے وہی کمرہ تھا جس میں لوگ اپنا سامان رکھ کر واپس آتے تھے۔

ساجد سامان کی الماری کے پاس کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے ڈیوٹی پر موجود سپاہی سے کہا،

"ابو نے کہا ہے۔ ذرا یہ سب سامان مجھے دے دو۔"

کانسٹیبل ساجد کو جانتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر مدن کا ہیٹ، آرٹسٹ کا کلر بکس اور ایک زنانہ پرس ساجد کو دے دئے۔ ساجد یہ چیزیں لے کر ایک خالی کمرے میں آیا۔ سب سے پہلے اس نے آرٹسٹ کا کلر بکس کھول کر دیکھا۔ اس میں کچھ تازہ تصویریں بنی ہوئی تھیں اور گیلے رنگ تھے۔ پھر اس نے زنانہ پرس کھول کر دیکھا۔

اور آخر میں ہیٹ کو غور سے دیکھا۔ پھر تینوں چیزیں رکھ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور سرچ لائٹ بجھا کر کمرے میں اندھیرا کر دیا۔

"کچھ بھی ہو" انسپکٹر شرما نے کہا، "میں سمجھتا ہوں معاملہ صاف ہے۔ ڈاکٹر مدن کا قتل مسز بملا کے شوہر پرتاپ نے کیا ہے۔ وہ یہاں سے کسی طرح قتل کر کے فرار ہو گیا ہے۔ مسز بملا اپنے گھر کا پتہ بتائیے۔ میں ابھی کچھ کانسٹیبل بھیج کر آپ کے شوہر کو گرفتار کرا لیتا ہوں۔ اس کے بعد معاملہ صاف ہو جائے گا . . . . "

انسپکٹر شرما کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا، کیوں کہ دروازہ کھلا اور ساجد وہ سارا سامان لے کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا، "ابو میں نے مجرم کو تلاش کر لیا ہے۔"

"ساجد!" انسپکٹر شہاب نے حیرت سے کہا، "تم نے مجرم کو تلاش کر لیا! یہ کیسے ممکن ہے؟ اور یہ تم سامان کیوں اٹھائے پھر رہے ہو؟"

"ابھی بتاتا ہوں ابوجان ——— میں ابھی مجرم کو آپ کے حوالے کئے دیتا ہوں۔ آپ اتنے حیران کیوں ہیں؟ آخر میں آپ ہی کا تو بیٹا ہوں۔"

"تمہارے خیال میں کون ہے مجرم ساجد بیٹا ———" انسپکٹر شرما نے سوال کیا۔

ابھی بتاتا ہوں انکل۔ لیکن مجرم کا نام بتانے سے پہلے میں ایک شعبدہ دکھانا چاہتا ہوں، یا یہ کہئے کہ یہ بتانا چاہتا ہوں مجرم نے اندھیرے میں کس طرح نشانہ لگایا ——— براہ کرم ذرا کمرے میں مکمل اندھیرا کرا دیجئے۔ بالکل گھپ اندھیرا ——— اور خیال رکھئے کہ کوئی صاحب کمرے سے باہر نہ جائیں۔

انسپکٹر شرما نے سوالیہ نظروں سے انسپکٹر شہاب کی جانب دیکھا۔ انسپکٹر شہاب نے 'ہاں' میں سر ہلا دیا۔ فوراً انسپکٹر شرما نے تمام روشنیاں گل کر دیں۔ کمرے میں گہرا اندھیرا ہو گیا۔ انسپکٹر شہاب احتیاطاً دروازے کے سامنے خود آ کھڑے ہوئے۔

اب اندھیرے میں ساجد نے کہا، "حضرات و خواتین، اب آپ ایک دل چسپ شعبدہ دیکھئے۔ سب لوگ ذرا غور سے دیکھئے۔"

سب لوگوں کی نگاہیں آواز کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ کمرے میں اس قدر تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔

یکایک اندھیرے میں روشنی کا ایک پیسے کے برابر دھبا سا حرکت کرتا نظر آیا، جیسے گہری اندھیری رات میں دور کوئی ستارہ چمک رہا ہو۔ وہ روشن دھبا ادھر ادھر لہرانے لگا۔ اس کے بعد ایک اور روشن دھبا پیدا ہو گیا۔ وہ بھی پہلے کی طرح حرکت کرنے لگا۔ یہ روشن دھبے خود تو روشن تھے، لیکن ان کی روشنی ادھر ادھر نہیں جا سکتی تھی۔

پھر تیسرا روشن دھبہ پیدا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسی آہٹ ہوئی جیسے کوئی اندھیرے میں بھاگا۔ انسپکٹر شہاب کے جسم سے کوئی جسم ٹکرایا۔ انسپکٹر شہاب نے بھاگنے والے کو پکڑا۔ بھاگنے والے نے انسپکٹر شہاب کے ایک گھونسا رسید کیا۔ لیکن انسپکٹر شہاب نے اس کو نہ چھوڑا اور وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

"روشنی کرو" انسپکٹر شرما نے چلا کر کہا۔

فوراً ہی روشنی کر دی گئی۔ اب انہوں نے دیکھا کہ انسپکٹر شہاب آرٹسٹ سے گتھم گتھا تھے۔ ادھر وہ روشنی کے دھبے یکایک غائب ہو گئے تھے۔ دو سپاہیوں نے فوراً آرٹسٹ کو قابو میں کر لیا۔

ساجد نے مسکرا کر کہا، "یہ آرٹسٹ صاحب ہی قاتل ہیں ابوجان۔ یہ دھبے جو آپ کاغذ پر دیکھ رہے ہیں، دراصل یہی اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ آرٹسٹ صاحب نے اپنے رنگوں میں فاسفورس ملا رکھا ہے اور فاسفورس کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ اندھیرے میں چمکتا ہے۔ بات بالکل سیدھی تھی جب ڈاکٹر مدن تاریک مکان

میں داخل ہونے لگے تو آرٹسٹ نے پیچھے سے ان کے کوٹ کی
پشت پر انگلیوں سے رنگ کے دھبّے لگا دیئے وہ دھبّے گھپ
اندھیرے میں ان کی پشت پر چمکنے لگے۔ اب قاتل کے لئے مقتول
کو تلاش کرنا اور نشانہ بنانا آسان تھا۔ قاتل نے ان دھبّوں کا
نشانہ بنا کر اندھیرے میں گولیاں چلادیں۔ گولیوں کے سوراخ
میں وہ فاسفورس ملا رنگ ختم ہو گیا۔ اور روشنی کا کوئی نشان
باقی نہ رہا۔ بھلا کون شک کر سکتا تھا کہ قاتل اپنے شکار کو شناخت
کرنے کے لئے ایسا عجیب طریقہ استعمال کرے گا۔

"ویری گڈ ــــ" انسپکٹر شرما نے آگے بڑھ کر ساجد
کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا، "تم واقعی ہونہار ہو بیٹا
اپنے ابّو کی طرح ذہین۔ لیکن تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ رنگوں میں
فاسفورس ملا ہے ؟"

ساجد نے شرماتے ہوئے کہا، "اسکول میں سائنس پڑھتا
ہوں۔ ہمارے ٹیچر نے آج ہی ہمیں فاسفورس اور اس کی خوبیوں
کے بارے میں بتایا تھا کہ فاسفورس اندھیرے میں چمکتا ہے۔
یہاں بھی اندھیرے کا مسئلہ تھا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ ممکن
ہے قاتل نے فاسفورس استعمال کیا ہو۔ چنانچہ میں باہر گیا۔ یہاں
یہ سب چیزیں رکھی تھیں۔ میں یہ چیزیں لے کر دوسرے کمرے میں
آیا اور اندھیرا کر کے میں نے دیکھا کہ کیا ان میں سے کوئی چیز
اندھیرے میں چمکتی ہے۔ دیکھا تو آرٹسٹ صاحب کے رنگ چمک
رہے تھے۔"

انسپکٹر شہاب نے ساجد کی کمر تھپکتے ہوئے کہا، "مجھے تم
پر فخر ہے ساجد تم نے واقعی ایک ایسا معمّہ حل کر دیا جو ہم سب
لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث تھا۔"

"ایک مشکل اب بھی باقی ہے ؟" انسپکٹر شرما نے کہا،
"اور وہ یہ کہ ہمارا خیال تھا قاتل مسز بملا کا شوہر پرتاپ ہے۔
اور مسز بملا کہتی ہیں کہ آرٹسٹ ان کا شوہر نہیں۔"

کیا عمدہ دوربین ہے، گیند کے ٹانکے تک نظر آرہے ہیں

انسپکٹر شہاب نے مسکرا کر کہا، "یہ مسئلہ میں حل کر دیتا ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے۔ آرٹسٹ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں
پڑ چکی تھیں۔ انسپکٹر شہاب نے آگے بڑھ کر آرٹسٹ کی فرنچ کٹ
داڑھی مٹھی میں پکڑی اور زور سے اُسے جھٹکا دیا۔ داڑھی انسپکٹر
کے ہاتھ میں آگئی۔ ساتھ ہی مسز بملا چلائیں، "پرتاب! تم!"

"یہ ہیں آپ کے پرتاپ صاحب۔" انسپکٹر شہاب نے
کہا، "انہوں نے اپنا میک اپ کیا۔ کسی آرٹسٹ سے یہ تصویریں
اور رنگ خریدا۔ رنگوں میں فاسفورس ملایا اور یہاں آگئے۔ میک اپ
اتنا عمدہ ہے کہ مسز بملا بھی ان کو نہیں پہچان سکیں۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں
سکتی تھیں کہ ان کا شوہر ایک آرٹسٹ کا میک اپ کئے کھڑا ہے۔ ہم
اس کے لئے ساجد میاں کے شکر گزار ہیں کہ ان کا فاسفورس پر آج
کا سبق ہمارے کام آگیا۔ میرا خیال ہے اب یہ معمّہ حل ہو گیا ہے
اور ساجد میاں نے تاریک مکان بھی دیکھ لیا ہے، اس لئے ہم
دونوں اب اجازت چاہیں گے۔

سب نے ساجد اور انسپکٹر شہاب کا بہت بہت شکریہ
ادا کیا۔ اور وہ دونوں واپس چل دیئے۔ ■■

صفائی پسند بیوی کے غصے سے بچنے کے لئے
اخبار
ملک کی
ایک
بڑی طاقت
سمندری بیڑہ
بے وقت کی
بارش سے
بچاؤ
کھلونا

بدنامی سے بچنے کے لئے

فوجی مشقوں کے لئے

چوری چھپے دیکھنے کے لئے
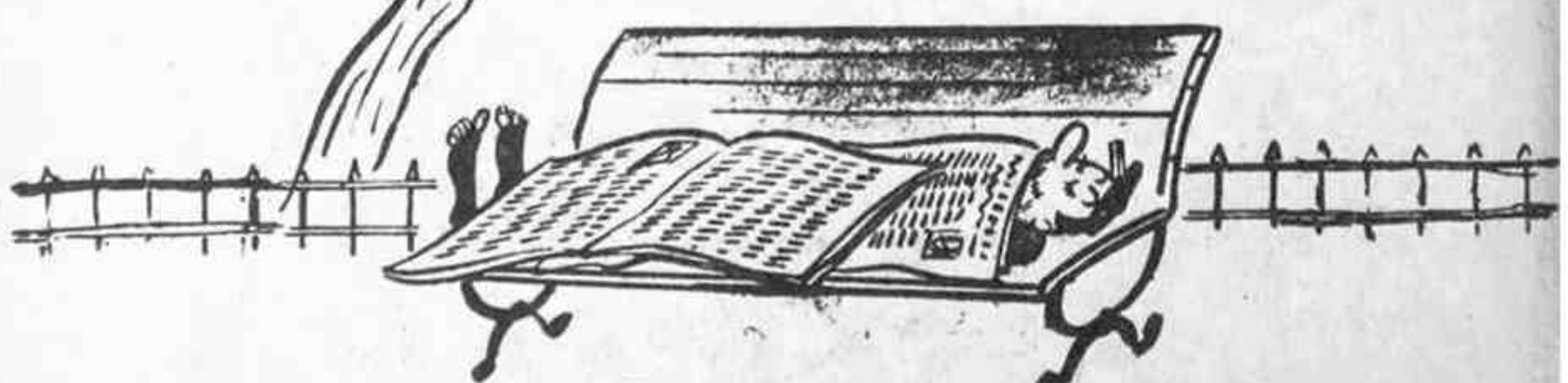
دن کے علاوہ رات کا بھی ساتھی!

انعامی ہاتھی

(۱)

(۲)
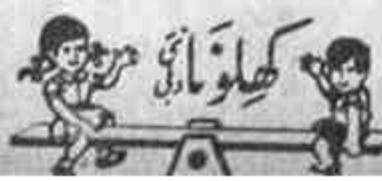
ان دونوں ہاتھیوں کو غور سے دیکھو اور ان سوالوں کا جواب دو۔

۱ - ان دونوں ہاتھیوں میں سے کون سا ہاتھی افریقہ کا ہے اور کونسا ہندوستان کا ؟

۲ - عام طور پر سرکس میں کونسا ہاتھی ہوتا ہے ؟

۳ - افریقہ کے ہاتھی کو تم کس طرح پہچان سکتے ہو؟

۴ - دونوں کے دانت کس چیز کے ہوتے ہیں ؟

اپنے جواب ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر " انعامی ہاتھی ، ماہ نامہ کھلونا آصف علی روڈ ، نئی دہلی نمبر ۱ ،، کے پتے پر بھیج دو۔ ۲۵ فروری تک ملنے والے جوابوں میں جو جواب صحیح ہوں گے اُن میں سے دس بہن بھائیوں کو ایک ایک روپیہ انعام دیا جائے گا۔

انعامی ہاتھی ، ماہ نامہ کھلونا ، آصف علی روڈ ، نئی دہلی نمبر ۱

حضرت غالبؔ کی روح سے معذرت کے ساتھ
اُن کی زمین میں بچّوں کے لئے ایک مزاحیہ غزل
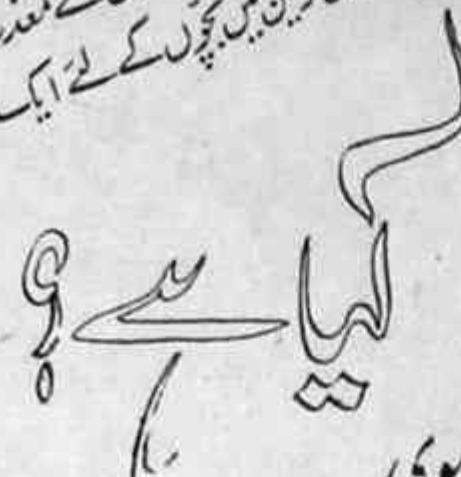
کیا ہے؟

یکتاؔ امروہوی

گیہوں کیا شے ہے، باجرہ کیا ہے؟
اور چاول ہے کیا، چنا کیا ہے؟

اُف یہ بستہ مِرے خدا کیا ہے!
میری تقدیر میں لکھا کیا ہے!

یہ سکول اور مدرسہ کیا ہے؟
اِن کے کھُلنے کا مُدعا کیا ہے؟

آج تک یہ سمجھ میں آ نہ سکا
لکھنے پڑھنے سے فائدہ کیا ہے!

یہ کِتابیں یہ کاپیاں یہ قلم
اِن میں کچھ تو کہو دَھرا کیا ہے؟

بس کِتابوں بھَرا بڑا بستہ!
اور ماں باپ نے دیا کیا ہے؟

ماسٹر مجھ کو مارتے کیوں ہیں؟
میں نے اِن کو بھلا کہا کیا ہے؟

آدمی سے بنَا دیا مُرغَا
اور اِس سے بڑی سزا کیا ہے؟

دیر چھُٹّی میں کیا ہے دیکھوں تو
اب گھڑی میں مری بجا کیا ہے

ہم کو امّی یہ پہلے بتلا دو
چائے کے ساتھ ناشتہ کیا ہے؟

جس نے کھائے نہ ہوں وہ کیا جانے
رَس بھری کیا ہے، گُلگُلا کیا ہے؟

سو گدھوں پر شکیل ہے بھاری
سامنے اس کے اِک گدھا کیا ہے

سَر مُنڈا کر وہ آ رہا ہے طفیل
بڑھ کے دے ٹیپ دیکھتا کیا ہے!

بات یکتاؔ کی مان اپنے لئے
سوچ اچھّا ہے کیا بُرا کیا ہے!
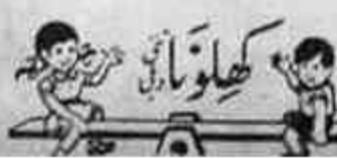
بچّوں کے لئے قابلِ قدر کتابیں

سُنہری بالوں والے بچّوں کا دیس

اُردو کی مشہور ادیب اور افسانہ نگار بیگم صالحہ عابد حسین بچّوں کے لئے کہانیاں بھی بڑی میٹھی اور سہل زبان میں اور بڑے سہانے اور من موہنے انداز میں لکھتی ہیں۔ اس کتاب میں جرمن بچّوں کے رہن سہن، کھیل کود، سبھاؤ اور برتاؤ کا حال کہانی کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس پر مصنفہ کو بچّوں کی کتابوں کے مقابلے میں حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیم کی طرف سے پہلا انعام ملا تھا۔ اچھی لکھائی چھپائی، نفیس کاغذ اور رنگین سرورق نے اس کی دلکشی کو اور بڑھا دیا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ

زعفران پریوں کے دیس میں (باتصویر)

یہ دونوں کہانیاں بیگم صالحہ عابد حسین نے اس قدر سہل الفاظ اور دل نشین انداز میں لکھی ہیں کہ ۸ سے ۱۲ برس تک کی عمر کے بچّے بڑی آسانی سے اور بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ قیمت چوالیس پیسے

زِندگی کے کھیل

مشہور اور مقبول ادیبہ اور افسانہ نگار بیگم صالحہ عابد حسین کے چھوٹے بڑے ناٹکوں کا مجموعہ۔ ان ناٹکوں میں زبان و بیان کی خوبیوں کے علاوہ ڈراما نگاری کے اصول اس طریقے سے برتے گئے ہیں کہ نہ صرف پڑھنے والے ان سے لُطف اُٹھاتے ہیں بلکہ اسکولوں اور کالجوں کی ڈراما سوسائٹیاں اور عام ڈرامیٹک کلب کامیابی کے ساتھ اسٹیج کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں۔

قیمت: دو روپے پچاس پیسے

بزمِ خیال

بیگم سیّدہ فرحت استادِ عصر حضرت اثر لکھنوی کی شاگرد ہیں اور برِّصغیر ہند کی شاعرات میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ اب تک ان کا کلام صرف خواتین کے مشاعروں میں اور عام مشاعروں میں سُنایا جاتا تھا یا آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتا تھا۔ اب اُن کی غزلوں اور نظموں کا یہ پہلا مجموعہ شائع ہوا ہے جس کے ذریعے سے اُن کا کلام اربابِ ذوق کے وسیع ترحلقے تک پہنچ سکتا ہے۔

قیمت: ایک روپیہ

سندر چنار	چوالیس پیسے
ایک اور ایک گیارہ	پچاس پیسے
دنیا بدل گئی	ساٹھ پیسے
اوجھل پری	اسی پیسے
ہزاروں برس میں	ایک روپیہ
عربی قاعدہ عالیہ عکسی خورد ...	بیس پیسے
پارہ عم عالیہ عکسی خورد	بیس پیسے

ظفر پیامی کا بچوں کے لئے ناول

ستاروں کے قیدی

قیمت دو روپے

ہندی پڑھنے کے لئے ہندی تاش

نیل گیان تاش

قیمت دو روپے

کھلونا — بک ڈپو — آصف علی روڈ — نئی دہلی

سراج انور

ایک سال پہلے ایک سال بعد

طوفان تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل مست ہاتھیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ کبھی کبھار اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلی اچانک لہرا کر رہ جاتی اور شیلا کو آس پاس کی چیزیں صرف ایک لمحہ کے لئے نظر آجاتیں ـــــ دُور دُور تک پھیلا ہوا بھیانک جنگل، دیووں کی طرح سر اُٹھائے ہوئے ہیبت ناک درخت، سرسراتی ہوئی جھاڑیاں اور ان جھاڑیوں سے زور آزمائی کرتی ہوئی تند و تیز ہوا! سڑک بالکل سنسان تھی۔ کچھ دیر پہلے کی چھائی ہوئی کہر کو اِس اچانک طوفان نے مٹا دیا تھا اور اب کار کی ہیڈ لائٹس میں شیلا سڑک پر نظر آنے والی ہر شے کو صاف دیکھ سکتی تھی۔ دُور دُور نظر آنے والے ٹُنڈ مُنڈ درخت اُسے میوے سے نظر آتے تھے۔ جیسے کچھ بھیانک لمبی لمبی شکلیں اونچائی سے اُسے چُپ چاپ دیکھ رہی ہوں۔ صاف ستھری سڑک پر پتّوں کے اِدھر اُدھر لڑھکنے سے یہ محسوس ہوتا تھا گویا ہزاروں روحیں سڑک پر چہل قدمی کر رہی ہوں۔ شیلا کا ننھا سا دل کانپ رہا تھا۔ وہ بار بار گھبرا کر اپنا ننھا سا ٹھنڈا ہاتھ موہن کے شانے پر رکھ دیتی تھی۔ موہن اس کا بھائی تھا، وہ جانتا تھا کہ شیلا اس ہیبت ناک ماحول میں بُری طرح ڈر رہی ہے۔ مگر اب وہ دلاسہ دینے کے علاوہ کر ہی کیا سکتا تھا؟

شیلا کی عمر بارہ، تیرہ سال کی تھی اور موہن بائیس سال کا خوب رُو نوجوان تھا۔ دونوں سرِ شام اپنے چھوٹے سے شہر سے نزدیک کے ایک قصبہ کی طرف چلے تھے۔ یہ قصبہ شہر سے تقریباً تیس میل دور تھا

بچے پہلے شور بہت مچاتے تھے، ہم نے یہ کھلونے لاکر انہیں دیدئے ہیں تاکہ وہ شور نہ مچائیں اور کھلونوں سے کھیلتے رہیں

اور موہن کو روانگی سے پہلے اس کا ذرا سا بھی احساس نہ تھا کہ موسم اتنا خطرناک اور بھیانک ہو جائے گا۔ وہ دونوں اپنے نانا اور نانی سے ملنے کے لئے اس قصبے کی طرف چلے تھے۔ اور اب خود موہن بھی پچھتا رہا تھا کہ وہ ناحق اس خطرناک موسم میں سفر پر نکلا۔ یوں تیس میل کار کا سفر کوئی معنی نہیں رکھتا مگر موجودہ صورت میں یہ سفر تین سو میل کا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ کار چلا رہا تھا اس کا پیر ایکسیلیٹر پر برابر زور دئے جا رہا تھا اور شیلا اس تیز رفتاری سے گھبرا کر موہن سے پٹی جا رہی تھی۔

طوفان لگاتار بڑھ رہا تھا۔ ہوا کے تھپیڑے کار کو ہلا رہے تھے شیلا ڈر رہی تھی کہ کہیں کار الٹ نہ جائے۔ طوفان نے واقعی کار کی چولیں ہلا ڈالی تھیں۔

ماحول کی ہیبت میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا۔ جب موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ٹھنڈی، تیر کی طرح چبھتی ہوائیں کار کے شیشوں کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ونڈ سکرین پر بارش کی ایک چادر سی نظر آتی تھی۔ سامنے کا منظر دکھائی دینا بند ہو گیا تھا، اس لئے موہن نے گھبرا کر شیشہ صاف کرنے والے وائپر چلا دئے۔ وائپر دائیں سے بائیں گھوم کر پانی کو ہٹا دیتے اور صرف ایک لمحہ کے لئے موہن کو سڑک نظر آجاتی۔ شیلا نے جب یہ دیکھا کر پانی کا زور بڑھتا ہی جا رہا ہے، بجلی بار بار کڑک رہی ہے اور پانی اب آہستہ آہستہ سڑک پر بڑھتا شروع ہو گیا ہے تو اس نے گھبرا کر بھائی سے کہا "بھیا کار روک لو ـــــ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ہم طوفان میں گھر گئے ہیں۔"

"ڈرنے کی بات نہیں ہے شیلا" موہن نے تسلی دی "بس اب ہمیں بیس میل اور جانا ہے۔"

"بیس میل بہت ہوتے ہیں بھیا۔ مری مانو تو کار کہیں آس پاس روک لو ـــــ" شیلا سردی سے کپکپانے لگی تھی۔

"نہیں شیلا، اس طرح تو ہم یہیں گھر جائیں گے۔ سڑک کے دونوں طرف کھیت ہی کھیت ہیں دُور دُور تک کوئی بھی نظر نہیں آتا جس میں ہم پناہ لے سکیں۔ گھبراؤ نہیں، بس اب ہم منٹوں میں پہنچ ہی جاتے ہیں۔"

شیلا کچھ نہ بولی۔ اس کا ننھا سا دل خوف کے مارے لرز رہا تھا۔ سامنے کے منظر کو دیکھنے کے لئے وہ آنکھیں زیادہ کھول لیتی اور اس طرح اس کی صورت اور بھی ڈری ڈری نظر آنے لگتی۔ کافی دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہی پھر اچانک اسے بائیں طرف سڑک سے کچھ ہی فاصلے پر ایک پرانی طرز کی خوب صورت عمارت نظر آئی جس کی کھڑکیوں میں سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ اس عمارت کو دیکھتے ہی وہ چیخی "بس بھیا کار روک کر وہاں لے چلو۔ ہم اس گھر میں پناہ لے لیں گے۔"

موہن نے فوراً بریک دبا دئے اور پھر بغیر سوچے سمجھے کار کا رُخ اس مکان کی طرف موڑ دیا۔

کار رکنے کے بعد دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے مکان کی طرف بڑھے۔ پرانی وضع کا لیکن نہایت خوب صورت اور پختہ مکان تھا۔ سُرخ کھپریل کی چھت تھی۔ مکان بلاشبہ بہت عمدہ تھا۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ موہن کا دل اس مکان میں قدم رکھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اُسے رہ رہ کر یہی احساس ہوتا کہ مکان کے اندر داخل ہونے پر وہ خواہ مخواہ کی پریشانیوں میں گھر جائے گا۔ دروازے

پر جو گھنٹی لگی ہوئی تھی ۔ اس کے پاس ہی پیتل کی ایک تختی پر یہ الفاظ کندہ تھے ۔

مُسافروں کو
کمرے کرائے پر مِل سکتے ہیں

یہ الفاظ پڑھتے ہی موہن اور شیلا کا خوف دُور ہوگیا ۔ موہن نے گھنٹی بجائی ، فوراً ہی ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا ، اور ان دونوں کو خوش آمدید کہا ۔ عورت کا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ کافی تعلیم یافتہ اور ملنسار بھی ہے ۔ موہن نے اُسے بتایا کہ دونوں بہن بھائی اس طوفانی رات میں ایک چھوٹا سا کمرہ رہائش کے لئے چاہتے ہیں ، بارش تھمتے ہی وہاں سے رخصت ہو جائیں گے ۔ یہ سُن کر بوڑھی عورت مسکرائی اور بولی " مُصیبت زدہ اور بھولے بھٹکے مسافروں سے میں ٹھہرنے کا کرایہ نہیں لیتی صاحب زادے ۔ اور پھر تمہیں تو صرف بارش اور طوفان سے پناہ لینی ہے ، اس لئے تم دونوں آج کی رات میرے مہمان ہو ——"

" آج کی رات ! " شیلا نے حیرت سے کہا " یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟ ہم تو صرف چند گھنٹوں کے لئے یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں ، بارش کچھ ہی دیر میں رُک جائے گی "

" نہیں میری بیٹی —— یہ طوفانی بارش فوراً رُکنے والی نہیں ہے ۔ تم آرام کرو ، جب بارش رُکے تو چلی جانا "

موہن اور شیلا بوڑھی عورت کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئے ، ایسا لگتا تھا جیسے وہ عورت اس مکان میں اکیلی ہی تھی ، اس نے آتش دان میں لکڑیاں ڈالیں ، اُسی نے بستر بچھائے اور اسی نے گرم گرم قہوہ ان دونوں کو پینے کے لئے دیا اور پھر ان دونوں کے پاس بیٹھ کر محبت بھرے لہجے میں اُن سے باتیں کرنے لگی ۔

" اماں ، آپ اس مکان میں اکیلی رہتی ہیں ۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا ؟ " شیلا نے پوچھا ۔

ننھا صرف کھیل رہا ہے ، یہ بھلا مچھلی کس طرح پکڑ سکتا ہے !

" ڈر کی کیا بات ہے بیٹی ! اور پھر میں صرف اسی وقت تو اکیلی ہوں ، میرے ملازم شہر سے کچھ سامان خریدنے گئے ہوئے ہیں ۔ بارش کی وجہ سے شاید وہ بھی شہر ہی میں کہیں رُک گئے ہوں گے ، اسی لئے انہیں یہاں آنے میں دیر ہوگئی "

" مگر آپ کے اس مکان میں دوسرے مسافر بھی تو ہوں گے ؟ " موہن نے دریافت کیا ۔

" بیٹا بدقسمتی سے دو تین دن سے ایک بھی مسافر نہیں آیا " بوڑھی عورت نے کہنا شروع کیا " اور پھر میں نے اپنے مکان کو ہوٹل تھوڑا ہی بنایا ہے ، میں تو لوگوں کو پینگ گیسٹ کے طور پر رکھتی ہوں ، یعنی ایسے مہمان جو مناسب دام ادا کر کے میرے گھر میں رہ سکیں ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ میرا مکان زیادہ مشہور نہیں ہے "

" پھر آپ کا گذارا کیسے چلتا ہے ؟ "

" جوں توں کر کے گذارا کر ہی لیتی ہوں ، مجھے اعتراف ہے کہ میری حالت اچھی نہیں ہے ۔ مگر کیا کروں ؟ ایک بیوہ عورت اچھی طرح گذر اوقات کیسے کر سکتی ہے ؟ چند لوگ جو تھوڑے بہت پیسے دے جاتے ہیں ، ان سے کام چل جاتا ہے "

" لیکن آپ نے ہم سے پیسے کیوں نہیں لئے ؟ " موہن نے پوچھا ۔

" تم دونوں تو صرف میرے مہمان ہو ، میں نے تمہیں پینگ گیسٹ

سمجھا ہی کب ہے ؟ تم کو میں نے مہمان سمجھا ہے اور مہمانوں سے لینا کچھ اچھی بات نہیں ہے "

موہن اور شیلا اس کی باتیں سن کر افسوس میں پڑ گئے عورت غریب تھی اور شریف تھی اور ایسی شریف عورت کی مدد کرنا اُن کا فرض تھا۔ بوڑھی عورت جب چلی گئی تو دونوں بہن بھائی اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گئے۔

موہن کی آنکھ مرغے کی بانگ سے کُھلی۔ اس نے اُٹھ کر کھڑکی کھولی اور باہر کے موسم کا اندازہ کرنے لگا۔ بارش رُک چکی تھی، خوفناک ہوائیں تھم گئی تھیں اور پو پھٹنے والی تھی۔ موہن نے سوچا، صبح ہونے پر بوڑھی میزبان ان دونوں کے ناشتے کا بندوبست کرے گی؟ اس کے پیسے بھی خرچ ہوں گے اور اُسے تکلیف بھی ہوگی ـــــ کیوں نہ وہ دونوں بہن بھائی اسی وقت چُپکے سے روانہ ہو جائیں اور پھر کبھی دن میں آکر معذرت کر لیں۔

اُس نے شیلا کو جگایا، شیلا بھی اس کی ہم خیال تھی، بلکہ شیلا نے یہ اچھی بات اور کہی کہ چونکہ بوڑھی عورت اس مکان کو ہوٹل کے طور پر استعمال کرتی ہی ہے اور اس نے ان دونوں کی اچھی خاصی خدمت بھی کی ہے، اسی لئے کسی ایسی جگہ پر جو میزبان عورت کو ایک نظر میں دکھائی دے جائے۔ دس دس کے دو نوٹ رکھ دئے جائیں، اور یہ نوٹ سفید لفافے کے اندر رکھے جائیں تاکہ مالکہ کے علاوہ اور کوئی اس لفافے کو ہاتھ نہ لگائے۔ یہ روپے عورت کی میزبانی کا بدل ہوں گے۔

موہن کو یہ بات بہت پسند آئی، اس نے میز کی دراز کھول کر ایک سادہ لفافہ نکالا، اس میں دس دس روپے کے دو نوٹ رکھے اور پھر وہ دونوں کپڑے پہن کر چوروں کی طرح دبے دبے پاؤں رکھتے ہوئے بڑے ہال میں آگئے۔ ہال میں آتش دان کے قریب ایک میز رکھی ہوئی تھی، اس میز کے پائے شیر کے پیروں جیسے بنائے گئے تھے۔ یہ میز آتش دان کے قریب ہی تھی اور موہن کو یقین تھا کہ جیسے ہی بوڑھی عورت یہاں آکر بیٹھے، اس کی نظر اس میز کی طرف ضرور جائے گی، اور وہ لفافہ اُٹھانے پر مجبور ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر موہن نے وہ لفافہ اس میز پر رکھ دیا اور پھر وہ دونوں دبے پاؤں مکان سے باہر آگئے۔ سڑک کے کنارے اُن کی موٹر پانی میں بھیگی کھڑی تھی، باہر ابھی تک اندھیرا تھا۔ موہن کیچڑ سے بچتا ہوا کار کے قریب پہنچا دروازہ کھول کر پہلے شیلا کو بٹھایا اور پھر خود بیٹھ گیا۔ کار کے اسٹارٹ کرنے کے بعد وہ دونوں تیز رفتاری سے قصبے کی طرف روانہ ہو گئے۔

صبح ہو رہی تھی، مگر شیلا کو اس قدر سردی لگ رہی تھی کہ اس کا دل چائے کا ایک کپ پینے کے لئے بے قرار تھا کوئی دس میل دُور آ جانے کے بعد ان دونوں کو ایک چھوٹا سا ریسٹوران نظر آیا موہن نے کار ریسٹوران کے دروازے پر لے جاکر روک دی۔ ریسٹوران کا بیرا ان دونوں سے ان کا آرڈر لے کر چلا گیا اور جب واپس آیا تو ہوٹل کا مالک بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اتنی صبح دو گاہکوں کو دیکھ کر ان دونوں کو حیرت تھی، اور پھر وہ موہن سے شہر کے بارے میں کچھ دریافت بھی کرنا چاہتے تھے۔ اُن دنوں شہر میں ایک پارٹی کا الیکشن ہونے والا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ موہن اُنہیں اس کے بارے میں کچھ بتائے۔ موہن سے جب اُنہوں نے یہ بات پوچھی تو اس نے اُنہیں بتایا کہ وہ تو طوفان میں پھنس گیا تھا اور کل شام کا شہر سے چلا ہوا ہے۔ اب بڑی مصیبت کے بعد یہاں آیا ہے۔

"آپ شام کے چلے ہوئے ہیں اور اب صبح کو یہاں آرہے ہیں! رات آپ نے کہاں گذاری؟" مالک نے پوچھا۔

"رات ـــــ رات تو ہم دونوں نے ایک خوب صورت سے مکان میں گذاری تھی" موہن نے جواب دیا "وہ یہاں سے دس میل پیچھے بائیں طرف ہے"

"وہی ننھا سا مکان تو نہیں جس کی چھت کھپریل کی ہے۔؟" بیرے نے خوف زدہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں وہی ـــ بارش سے بچنے کے لئے ہم اس مکان پر گئے، اس کی بوڑھی مالکہ نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ ہمارے لئے آتش دان میں آگ جلائی، ہمیں قہوہ پلایا، ہمارے بستر بچھائے اور بڑی خاطر مدارات کی ـــ"

"جی ہاں ـــ" شیلا نے خوش ہو کر کہا "بے چاری بڑی اچھی عورت ہے، بتا رہی تھی کہ وہ لوگوں کو پیئنگ گیسٹ کے طور پر اپنے ہاں ٹھہراتی ہے۔ مگر اس نے ہم سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا ـــ"

"آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ وہ عورت اس مکان میں موجود تھی!" مالک نے پوچھا۔

"جی ہاں یہی میرا مطلب ہے ـــ"

"اور وہ مکان بھی صحیح سلامت اور بالکل نئی حالت میں تھا؟"

"جی ہاں ـــ کیوں آپ کو اس میں کوئی شک ہے؟"

"آپ دونوں کو تکلیف تو ہوگی، مگر مجھے اس بوڑھی عورت سے ایک کام ہے۔ اگر آپ اپنی کار میں مجھے وہاں لے جاسکیں تو میں بے حد شکر گزار ہوں گا ـــ" مالک نے کہا۔

دن نکلا ہوا تھا، اس لئے موہن، شیلا اور ریسٹوراں کے مالک کو کار سے اس جگہ پہنچنے میں صرف پندرہ منٹ لگے۔ لیکن یہ دیکھ کر موہن اور شیلا کے دل لرز گئے کہ وہاں اب اس عالی شان عمارت کی بجائے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر ہیں اور کچھ نہیں۔ نہ کھپریل کی چھت ہے، نہ کھڑکی اور نہ خوب صورت دیواریں۔ سب کچھ جلا ہوا ہے۔ وہ سب کار سے اُتر کر اس عمارت کے قریب گئے۔ ریسٹوران کے مالک نے موہن کو بتایا کہ وہ تو صرف ان دونوں کو حقیقت بتانے یہاں لایا ہے۔ بوڑھی عورت پتا چاچی ایک سال پہلے اس مکان میں ضرور موجود تھی، اور مکان بھی صحیح سلامت تھا۔ مگر ایک رات مکان میں آگ لگ گئی اور سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا ـــ

جیلر صاحب، میں اُتر کر بھاگ نہیں رہا ہوں۔ میری کوٹھری میں آگ لگ گئی ہے، اُسے بجھانے جا رہا ہوں۔

پتا چاچی بھی جل مری۔ یہ ایک سال پہلے کی بات ہے۔ پھر بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ موہن اور شیلا پچھلی رات اس عمارت میں ٹھہرے ہوں اور بوڑھی عورت نے اس کی میزبانی کی ہو۔

بات اتنی حیرت انگیز تھی۔ شیلا اور موہن گُنگ رہ گئے۔ ریسٹوراں کا مالک انہیں جھوٹا سمجھ رہا تھا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ اُن دونوں نے وہاں رات بسر کی تھی۔ شیلا جلے ہوئے مکان کے اندرونی حصے میں یوں ہی چلی گئی اور پھر یکایک اس نے ایک چیخ ماری ـــ اس کی سچائی کا ایک ثبوت مل گیا تھا۔ وہ اور موہن سچ مچ پچھلی رات وہاں رہے تھے۔ وہ بوڑھی عورت کے مہمان رہے تھے، اور یہ سچائی یا حقیقت اس پر ایک نشانی سے ظاہر ہوئی تھی۔

ٹوٹے پھوٹے آتش دان کے قریب، شیر کے پاؤں والی میز پر ایک سفید لفافے میں دس دس روپے کے ڈیڑھ نوٹ احتیاط سے رکھے ہوئے تھے۔ ●●

بچّوں کے لئے باتصویر معلوماتی کِتابیں

پڑھو اور بڑھو
ان لوگوں کے حالات جنہوں نے ہرقسم کی مجبوریوں کے باوجود پڑھ کر دنیا میں نام پیدا کیا۔ ۷۵ پیسے

ببر شیر
اس کتاب میں جنگل کے راجہ ببر شیر کی زندگی اور عادتوں کے مکمل حالات پیش کئے گئے ہیں جسے ایک بار شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ قیمت ۷۵ پیسے

چاند کی کہانی
چاند کتنا بڑا ہے؟ کتنی دُور ہے؟ یہ گر کیوں نہیں پڑتا؟ یہ اور اسی طرح کے اٹھارہ سوالوں کے جواب اس کتاب میں ملیں گے۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

نُو سیّارے اکتیسؔ چاند
اس کتاب میں نظام شمسی کی پیدائش، سیاروں سے سورج اور زمین کا فاصلہ، ان کی گردش کی رفتار اور سیاروں کے دلچسپ حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اور ساٹھ تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

چاند کی طرف پہلا قدم
سنہ ۱۹۶۱ء میں ۱۲- اپریل کو روس کے ایک ۲۷ سالہ نوجوان نے چاند پر پہنچنے کا کامیاب سفر کیا۔ اس نوجوان کا نام ہے یوری گگارین۔ پوری کتاب دلچسپ واقعات سے بھری ہے اور ۲۸ تصویریں بھی ہیں۔ قیمت ۲ روپے

بڑے سے بڑے جانور
اس حیرت انگیز کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ساری دنیا میں جانوروں کی کتنی قسمیں ہیں اور ہر قسم کا بڑے سے بڑا جانور کیسا ہوتا ہے۔ تمام جانوروں کی تصویریں بھی اس کتاب میں دی گئی ہیں۔ قیمت ۷۵ پیسے

کاربن کی کہانی
اس کتاب میں کاربن اور اس سے بننے والی چیزوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

کوئلے کی کہانی
انگریزی کی ایک کہاوت مشہور ہے "کول از گولڈ"۔ تجارت کی تجارت میں کوئلے کا کتنا حصّہ ہے۔ یہ کہاں کہاں پایا جاتا ہے۔ اس سے کیا کیا بنتا ہے یہ جاننے کیلئے کوئلے کی کہانی ضرور پڑھیئے ۷۵ پیسے

پٹرولیم کی کہانی
اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ پٹرولیم یا مٹی کا تیل ہمارے روزانہ کے استعمال میں آنے والی چیزوں میں کیا درجہ رکھتا ہے زمین سے اس کو نکالنے کے کون کون سے طریقے اپنائے گئے ہیں۔ قیمت ۳۷ پیسے

ہیرے کی کہانی
ہیرا ہندوستان میں سب سے پہلے کس زمین سے نکلنا شروع ہوا؟ کہاں کہاں اس کی کانیں ہیں اور یہ زیادہ سے زیادہ کتنی قیمت کا ہوتا ہے۔ قیمت ۳۷ پیسے

چاند تاروں تک سفر
اس کتاب میں ہوائی جہاز کے ایجاد ہونے کی داستان بہت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہوا میں اُڑنے کا فن رفتہ رفتہ اتنا ترقی یافتہ کس طرح ہوا، کہ اب چاند تک سفر کرنا بھی ممکن ہے۔ قیمت ۲۵ پیسے

قدرتی گیس کی کہانی
گیس کیا ہے؟ اس کا استعمال ہم کس طرح کرتے ہیں یہ باتیں جاننے کے لئے قدرتی گیس کی کہانی ضرور پڑھئے۔ قیمت ۳۷ پیسے

مرزا غالبؔ
مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اردو کے بہت بڑے شاعر تھے۔ اُن کی مزے دار زندگی کو مصنف نے ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے اور مرزا کی ایک اصلی تصویر بھی دی گئی ہے۔ قیمت ۷۵ پیسے

جواہر لال نہرو
اس کتاب میں چاچا نہرو کی زندگی کے پہلے دن سے لے کر اس وقت تک کے تمام واقعات ہیں جب وہ ہم کو روتا چھوڑ کر دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور بہت دور چلے گئے۔ ایک روپیہ

ہندوستان شاہراہِ ترقی پر
آزادی کے بعد ہمارے عظیم ملک ہندوستان نے جو کچھ ترقی کی ہے۔ وہ اس کتاب میں نہایت دلچسپ طریقے پر بیان کی گئی ہے۔ اپنے وطن کی ترقیوں کی معلومات کے لئے یہ کتاب ضرور پڑھئے

قیمت: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

کھلونا بک ڈپو آصف علی روڈ نئی دہلی

ضیاء عظیم آبادی

ماں کے ہاتھ

ماں کے پیار کی گہرائی کو کون نہیں جانتا؟ اور وہ بھی ماں تھی ــــ رانی ماں اس کے دو بیٹے تھے۔ وہ ان پر وار وار کر پانی پیتی تھی اور ہر گھڑی ان کی خوشی پوری کرنے کے لئے تیار رہتی تھی۔ اسی لئے دونوں من مانی کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔

لاڈلے بیٹے جو ٹھیرے۔ وہ تو کہو ماں کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ اس لئے اپنے ضدی بچوں کے ناز اٹھانے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

ماں نے پیار سے ایک کا نام بھولے رکھا تھا، دوسرے کا راجہ۔ ناموں کا اثر لڑکوں پر اچھا خاصا پڑا تھا۔ راجہ سچ مچ اپنے کو راجہ سمجھتا تھا۔ وہ ہر موقع پر اپنی ہی چلانا چاہتا تھا ــــ کھیل بھی کھیلتا تو نرالے، کرسی پر کرسی رکھ کر راج سنگھاسن بناتا۔ دو پیسے کی نقلی مونچھیں لگا لیتا اور کمر میں لوہے کے ایک ٹکڑے کو تلوار کی طرح لٹکا کر بڑی شان سے اُچک کر بلندی پر جا بیٹھتا اور بھولے کو حکم دیتا، "تمہارا نام بھولے ہے اور بھولے کہتے ہیں اس کو جو بے خبر اور بے وقوف ہوتا ہے۔ تم راج نیتی سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے، البتہ حساب کتاب اچھا کر سکتے ہو۔ لو یہ بہی کھاتہ اور جمع خرچ لکھا کرو۔ راج ہم کریں گے، صرف ہم۔"

بھولے ویسے تو عمر میں راجہ سے بڑا تھا، مگر کچھ گول
مٹول سا تھا۔ اچھی خاصی توند اور ڈھیلا ڈھالا بدن۔ کبھی کبھی
کھیل کھیل میں وہ بگڑ جاتا تھا۔ وہ کہتا، "یہ نہیں ہوگا، ہم بھی
راجہ بنیں گے اور راج سنگھاسن پر بیٹھیں گے۔"

راجہ کی چمکتی ہوئی آنکھیں یہ سُن کر خونِ کبوتر بن جاتی
تھیں۔ وہ اوپر سے چھلانگ لگا کر لڑنے مرنے کو آمادہ ہوجاتا
تھا۔ دونوں تلے اوپر کے بھائی تھے، خوب چھنتی تھی۔ کبھی کسی کا
سر ٹوٹتا، کبھی کسی کا ماتھا پھوٹتا۔ روتے گاتے، رُوٹھتے منتے اور
پھر ایک ہو گئے۔ ناخن سے گوشت کہیں جدا ہوا کرتا ہے؟

ماں ان کی لڑائیوں سے جی ہی جی میں کُڑھتی بھی تھی،
خوش بھی ہوتی تھی۔ وہ سوچتی ان کی لڑائی ہی کیا! ایک بار روٹھیں گے
تو دوسری بار ایک دوسرے کے پسینے پر خون بھی بہادیں گے۔
اور اکثر ایسا ہوا بھی تھا۔ جب کبھی کسی دوسرے نے اُن
میں سے ایک کو بھی آنکھیں دکھائیں تو وہ دونوں پنجے جھاڑ کر اس
کے پیچھے پڑ گئے اور اُسے دُم دبا کر بھاگتے ہی بنی۔

ایک دن دُور دیس سے ایک بڑا ہوشیار بنجارہ انیک
چیزیں لے کر آیا۔ مال دار ماں کے دونوں بچے اس کے گرد منڈلانے
لگے۔ جو ایک خریدتا وہ دوسرا ضرور لیتا۔ بنجارے کا مال ان لڑکوں
کے درمیان مونہہ مانگے داموں بکنے لگا۔ دولت کی یہ فراوانی
دیکھ کر اس کے مونہہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے سوچا، "یہ سونے کی
چڑیا اگر اپنے پنجرے میں آجاتی تو کتنا اچھا ہوتا! یعنی ان کا راج
ان کا دیس اپنے قبضے میں ہوتا تو کیا مزہ رہتا!"

لیکن سونے کی چڑیا کو قابو میں کرنا کچھ آسان تو تھا نہیں۔
اُس نے یہ چال چلی کہ بھولے اور راجہ کو الگ الگ بھڑکانا شروع
کیا۔ راجہ سے اس نے کہا، "تم سچ مچ راجہ ہو۔ مگر یہ بھی جانتے
ہو، بھائی سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں اور بھائی سے بڑھ کر کوئی
دشمن بھی نہیں۔ پھر تمہارا بھائی تو تم سے بڑا بھی ہے۔ وہ کیسے تمہیں
راجہ بننے دے گا؟ اگر چاہتے ہو کہ تمہاری راج گدی بنی رہے
تو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناؤ۔"

بھولے کو اس نے یہ کہہ کر طیش دلایا "بڑے ہو کر چھوٹے
سے دبتے ہو! شرم نہیں آتی تمہیں؟ ذرا یہ تو سوچو تمہارا بھائی
کتنا گھمنڈی ہے۔ وہ کہتا ہے راج ہم کریں گے، یہی کہا تم لکھا۔
اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ وہ حاکم رہے گا، تم غلام۔ بس اسی میں خیریت
ہے کہ اس کا سارا غرور پہلے ہی قدم پر کچل دو، ورنہ ہاتھ مل کر رہ جاؤ گے۔"

بچے تو بچے ہوتے ہی ہیں، چالاک بنجارے کی باتوں میں
آ گئے اور ایک دوسرے سے تن گئے۔ ماں نے بھی اس کھنچاؤ کو محسوس
کیا۔ ایک دن اُس نے لڑکوں کو ٹوک ہی دیا، "یہ تم دونوں کے چاند
سے ماتھے پر ہر وقت بل کیوں رہتا ہے۔ بڑی بُری بات ہے ___
اس طرح تو گھر تباہ ہوجاتا ہے۔"

"ہم اپنا گھر الگ بنائیں گے۔" راجہ نے مونہہ پُھلا کر جواب دیا۔
"کیا کہا تم نے؟" ماں کے ہوش اُڑ گئے "الگ گھر کیسا؟"
"جہاں بس ہم ہی ہم ہوں۔" راجہ نے اُسی تیور سے کہا۔
"میں اپنی زندگی میں تو ایسا ہونے نہیں دوں گی۔" وہ
فیصلہ کُن انداز میں بولی۔

راجہ کو ہوش آنے لگا۔ بنجارے نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ رہا
ہے تو فوراً اس سے کہنے لگا "ماں بڑے بیٹے کا ساتھ دے رہی ہے۔
وہ اُسی سے محبّت کرتی ہے۔ تم سے اُسے پیار نہیں ہے۔ اور جس
ماں کو تم سے پیار نہ ہو اس کا کہا مان کر کیا کرو گے؟"

راجہ تو تھا ہی راجہ، اپنی راج ہٹ کے تماشے دکھانے لگا۔
اس نے ماں سے ناطہ توڑ لیا اور سچ مچ کی تلوار لے کر میدان میں کُود
پڑا۔ اس نے نعرہ لگایا، "یا اپنا حصّہ لے کر رہیں گے یا جان
دے دیں گے۔"

ماں کا دل تو موم کا ہوتا ہے۔ وہ چہیتے بیٹے کو مرنے سے

بچانے کے لئے اپنے جسم کے دو ٹکڑے کر دینے کے لئے مجبور ہو گئی ــــــ اور تم جانتے ہی ہو جب جسم کے دو ٹکڑے ہوتے ہیں تو خون بہتا ہی ہے چنانچہ خوب خون بہا۔ بنجارے نے مرہم پٹی بیچنا شروع کر دیا۔ اُسے تو جھولی بھرنے سے غرض تھی۔ اِس بہانے اچھی طرح اس کی جھولی بھر گئی۔ وہ آگ لگا کر دُور کھڑا تماشہ دیکھتا رہا اور اپنی جھولی بھرتا رہا۔

پھر گھاؤ بھرنے لگے۔ لہو کی دھارا تھم گئی۔ تھوڑی بہت چھینٹیں کبھی کبھار اُڑتیں اور بھولے اور راجہ الگ الگ ہو کر بھی قریب ہی قریب دکھائی دینے لگے۔

بنجارے نے سوچا، "یہ وار تو بھرپور نہیں پڑا۔ دونوں بچے آپس میں ایک ہی ہیں۔ اور یہ ایک رہیں گے تو ان کی طاقت بنی رہے گی۔ انہیں کم زور کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ میری اپنی گرفت مضبوط ہو سکے" ــــــ اور اس نے ایک منتی کھیلتی جنت کی آڑ لی۔ اس نے دونوں سے الگ الگ ایک ہی بات کہی، "یہ جنت تمہاری ہی ہے۔"

یہ کہہ کر بنجارے نے جہنم کی آگ بھڑکا دی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ ہرے بھرے گھر جلنے لگے۔ راجہ نے سوچا، "میرا اب بھولے سے واسطہ ہی کیا ہے؟ ماں بھی بھولے کے ساتھ میرے لئے پرائی ہو گئی ــــــ اسے کیوں میرے دُکھ درد کا پاس ہونے لگا ــــــ میں مروں یا زندہ رہوں اس کی بلا سے۔ میرا اب اگر کوئی ہے تو بس دُور دیس والا بنجارہ۔" اُسے کچھ ہوش نہ تھا کہ یہ بنجارہ تو اس کا پکا دشمن تھا، اسی نے پھوٹ ڈالی تھی اور اب اس پھوٹ سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔

پھر راجہ دیوانوں کی طرح میدانِ جنگ میں کود پڑا۔ اس کا تیر بھولے کی چھاتی میں لگا۔ ساتھ ہی اس کے اپنے کلیجے میں بھی ایک تیر چبھا۔ وہ تڑپ اٹھا۔ پھر یکایک اسے خیال آیا، "بھولے کا تیر تو ماں نکالے گی۔ میرے پہلو سے کون تیر نکالے گا؟ میرے لئے تو بھولے کے ساتھ ماں بھی غیر ہو چکی ہے۔" یہ سوچ کر اس کی کھٹک دونی ہو گئی۔ اس نے دُور کھڑے ہوئے بنجارے کی طرف حسرت سے دیکھا۔ ٹھیک اُسی وقت اس کے کانوں میں آواز آئی، "راجہ!"

وہی جانی پہچانی آواز ــــــ ایک بدنصیب ماں کی دُکھ بھری آواز۔ راجہ اپنے آپ کو بھول گیا۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ پھر اس نے خواب سا دیکھا ــــــ ماں کے بال بکھرے ہوئے ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، چہرہ سفید ہو گیا ہے۔ اس کے کپکپاتے ہوئے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہی ہے، "آؤ میرے لال، میں تمہارے پہلو سے تیر نکال دوں ــــــ بنجارے کی طرف نہ دیکھو بیٹا ــــــ وہ ایسے وقت پر ساتھ دینے کا عادی نہیں ہے۔ یہ ماں ہی کا کلیجہ ہوتا ہے جو رُوٹھے ہوئے بیٹے کو بھی منانے سے مونہہ نہیں موڑتا۔ تم نے مجھے پرایا سمجھ لیا ہے۔ مگر میں تو تمہیں پرایا نہیں سمجھ سکتی۔ تم کتنے ہی بچھڑ جاؤ، کچھ بھی اپنا نام رکھ لو، لیکن رہو گے تو میرے بیٹے ہی۔"

راجہ چونک پڑا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا اور بالکل غیر ارادی طور پر پکار اٹھا، "ماں!"

دُور بہت دُور، ماں نے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے کی آواز سُنی ــــــ دِل کو دل سے راہ جو ہوتی ہے۔ ماں کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اُسے خیال آیا، "ناخن سے گوشت جدا نہیں ہوا کرتا ــــــ دُور رہ کر بھی دونوں بھائی قریب ہی رہیں گے۔ آخر ہیں تو میرے ہی بیٹے۔"

اور اس کے دونوں ہاتھ ایک ساتھ دراز ہو کر بھولے اور راجہ کے سینوں سے تیر نکالنے کے لئے پہنچ گئے ــــــ ممتا سے بھرپور ہاتھ ــــــ ماں کے ہاتھ۔

●●

زلفی
ہیئر ٹانک
زلفی ہیئر ٹانک بالوں کی افزائش، چمک خوشنمائی
کے لئے مشہور ہے یہ گرتے بالوں کو روکتا ہے سفیدی
کو سیاہی کا راستہ دکھاتا ہے اور گنجے پن کا دشمن ہے
اس کے علاوہ بالوں کی ۲۴ دوسری بیماریوں کو جو
بالوں کی دشمن ہیں بالکل ختم کر دیتا ہے۔ زلفی میں
کوئی مصنوعی خوشبو نہیں ہے۔ زلفی تیل نہیں بلکہ
بالوں کی غذا ہے۔ زلفی بالوں میں ڈالئے اور پھر
دیکھئے وہ کتنی جلدی بڑھتے ہیں۔ فی شیشی چھ روپے
SHAMA LABORATORIES
بالوں سے پیار ہے تو زلفی بالوں میں ڈالئے
شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی

انعامی تصویر نمبر ۵

اوپر ایک تصویر شائع کی جارہی ہے جس کا عنوان نہیں دیا جارہا۔ تم اس کا کوئی خوب صورت سا دل چسپ عنوان سوچو اور ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر " انعامی تصویر نمبر ۵ ۔ ماہ نامہ کھلونا ۔ آصف علی روڈ ، نئی دہلی نمبر ۱ " کے پتے پر بھیج دو۔ ۱۸ فروری تک ملنے والے جوابوں میں جس کھلونا بہن بھائی کا عنوان سب سے اچھا اور دل چسپ ہوگا اُسے پانچ روپے کی کتابیں انعام دی جائیں گی۔ پسند آنے والے اور بھی بہت سے عنوانات شائع کئے جا سکتے ہیں۔

انعامی تصویر نمبر ۵ ، ماہ نامہ کھلونا ، آصف علی روڈ ، نئی دہلی

پِھسلنے کا خبط

یہ لڑکی اسکیٹنگ کی ماہر ہے،
اس لئے ایک طرف کے پہیّوں پر توازن
قائم کئے پھسل رہی ہے
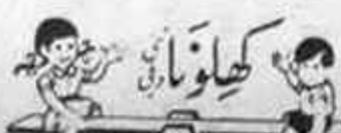
جب امریکہ میں نئی عمر کے
من چلے پانی پر اسکیٹنگ سے اُکتا گئے
اور انہوں نے یہ بھی
محسوس کیا کہ یہ کھیل سب نہیں
کھیل سکتے تو وہ اسکیٹ بورڈ کو خشکی پر
کھینچ لائے، اس میں
ننھے منے پہیے لگائے اور جلد ہی زمین پر
پھسلنے کی وَبا امریکہ بھر میں
سڑکوں اور بازاروں میں پھیل گئی۔
ڈھلوانوں اور موڑوں پر، تیز رفتار کاروں
سے بھرے ہوئے راستوں پر
اسکیٹنگ کرتے جیالے نظر آنے لگے۔
حادثے خوب ہوئے،
اس لئے کہ چھوٹا سا پتھر بھی سوار کی راہ میں
آکر اس کے توازن کو درہم برہم
کرسکتا ہے۔ دو لڑکے تو اس مشغلے کے
ہاتھوں کاروں کی جھپٹ میں آکر
جان بھی گنوا بیٹھے۔
لیکن یہ نئی نسل خطروں کو کب خاطر میں
لاتی ہے؟ اس لئے پورے
جسم میں گُدگُدی اور جُھرجُھری کی لہر
دَوڑا دینے والا
یہ کھیل اپنے لئے روز بروز زیادہ شیدائی
بناتا جارہا ہے۔

لیکن ان صاحبہ کو ایسا لگ رہا ہے
گویا کیلے کے چھلکے پر پھسلتی جارہی ہوں' اس لئے سہارے
کے لئے انہوں نے بیٹے کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔

ڈیڑھ ٹانگ کی دوڑ ہو رہی ہے . . . کبھی کبھی یہ بھی ڈر رہتا ہے
کہ کہیں سچ مچ ہی ڈیڑھ ٹانگ نہ رہ جائے

کرتب باز اسکیٹ بورڈ پر کرتب دکھاتے ہیں

منّے میاں خود بھی گرتے ہیں اور دو تین راستہ چلتوں کو بھی
اُلجھا کر گرا دیتے ہیں

کبھی کبھی تو دیکھنے والا بھی فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ
کرتب دیکھ رہا ہے یا حادثے کی شروعات
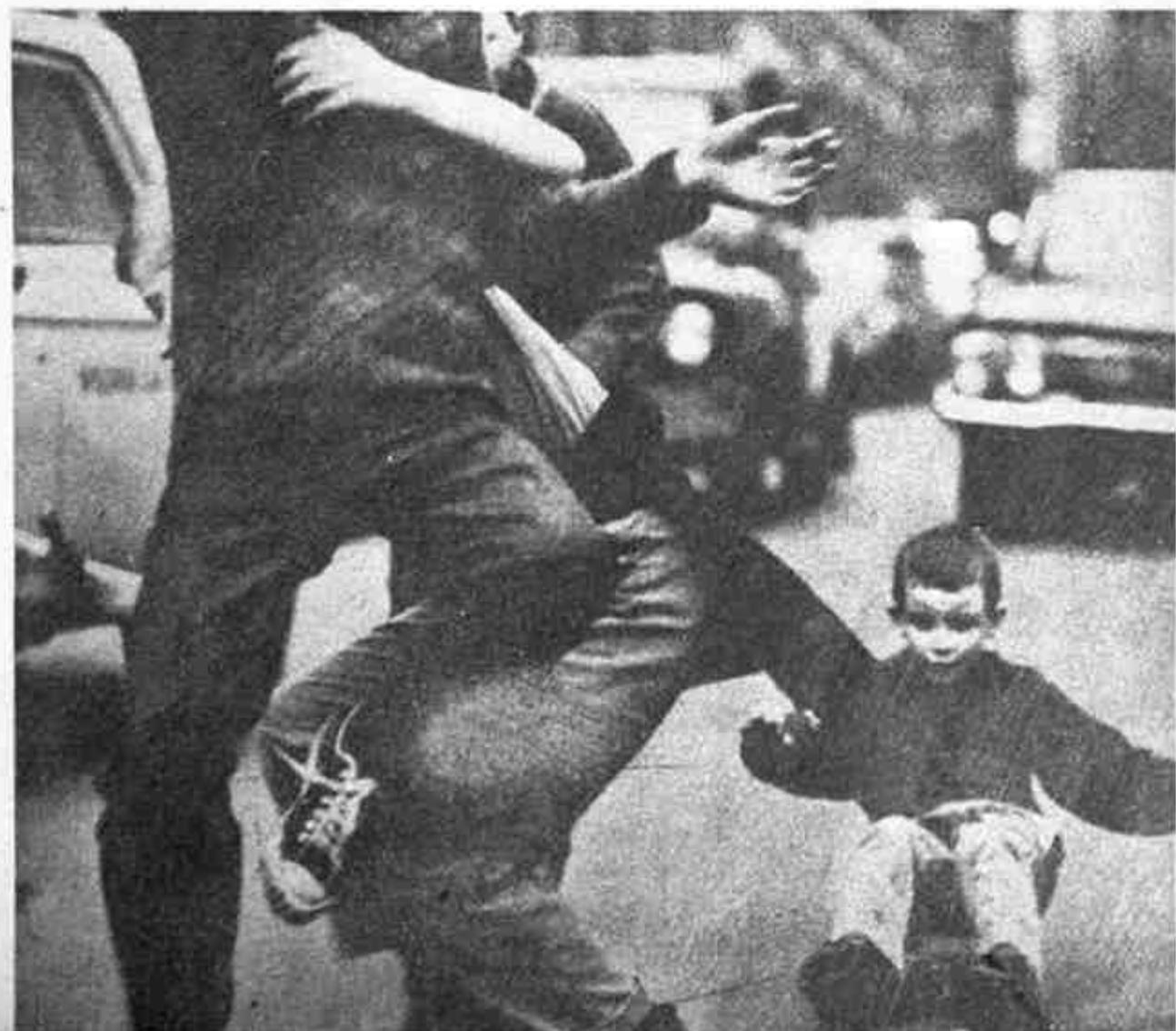
یہ نوجوان اسکیٹ بورڈ پر
بالٹی رکھ کر اور اس پر خود کھڑا ہو کر
دوڑ رہا ہے
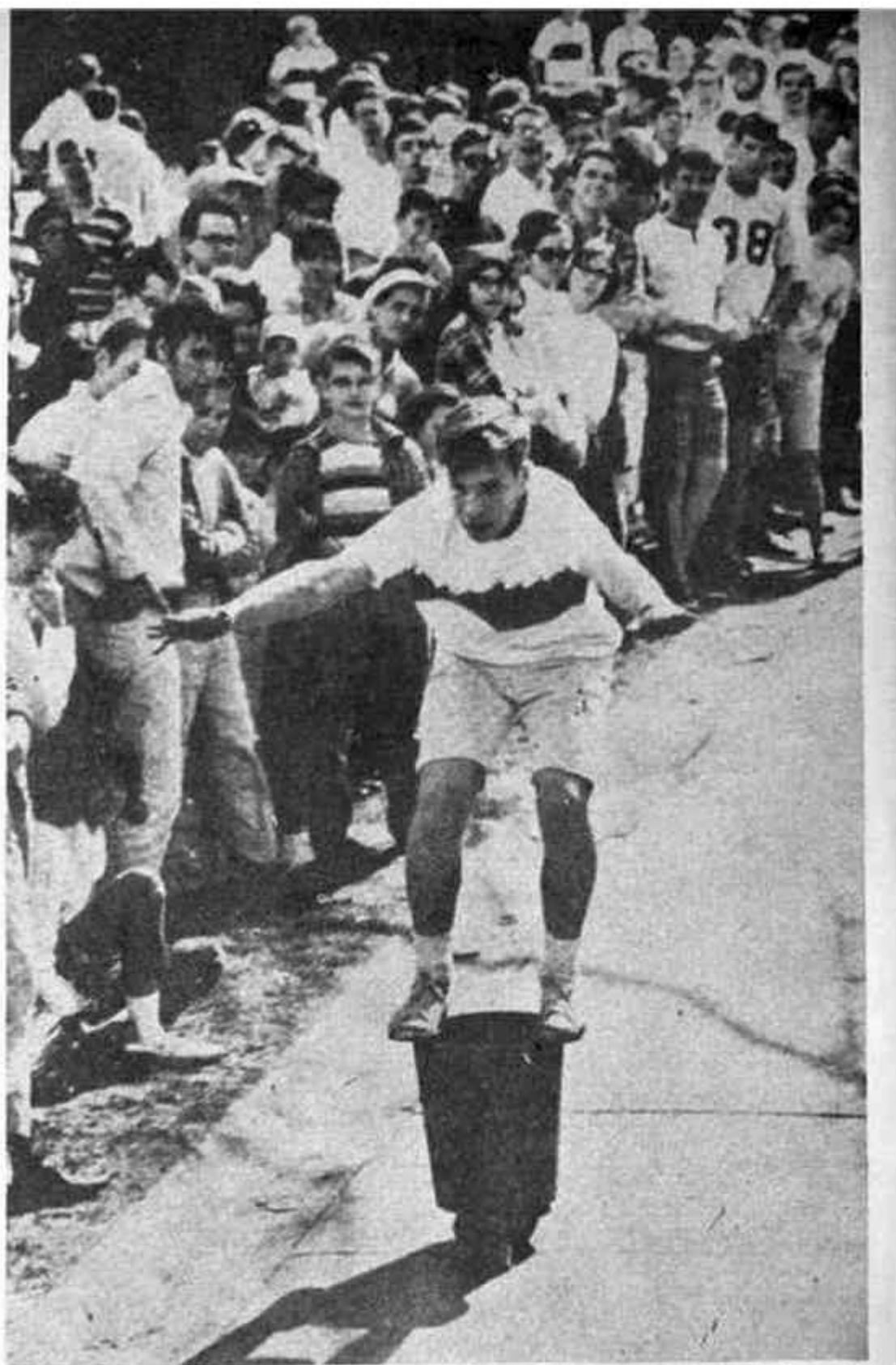
یہ نوجوان کھڑے کھڑے اکتا
گیا تو لیٹ کر اسکیٹنگ کرنے لگا۔
توازن سادھنا اس کے لئے جتنا
مشکل تھا، اتنا ہی
ضروری بھی تھا، ورنہ سر ٹوٹنے
کا اندیشہ تھا
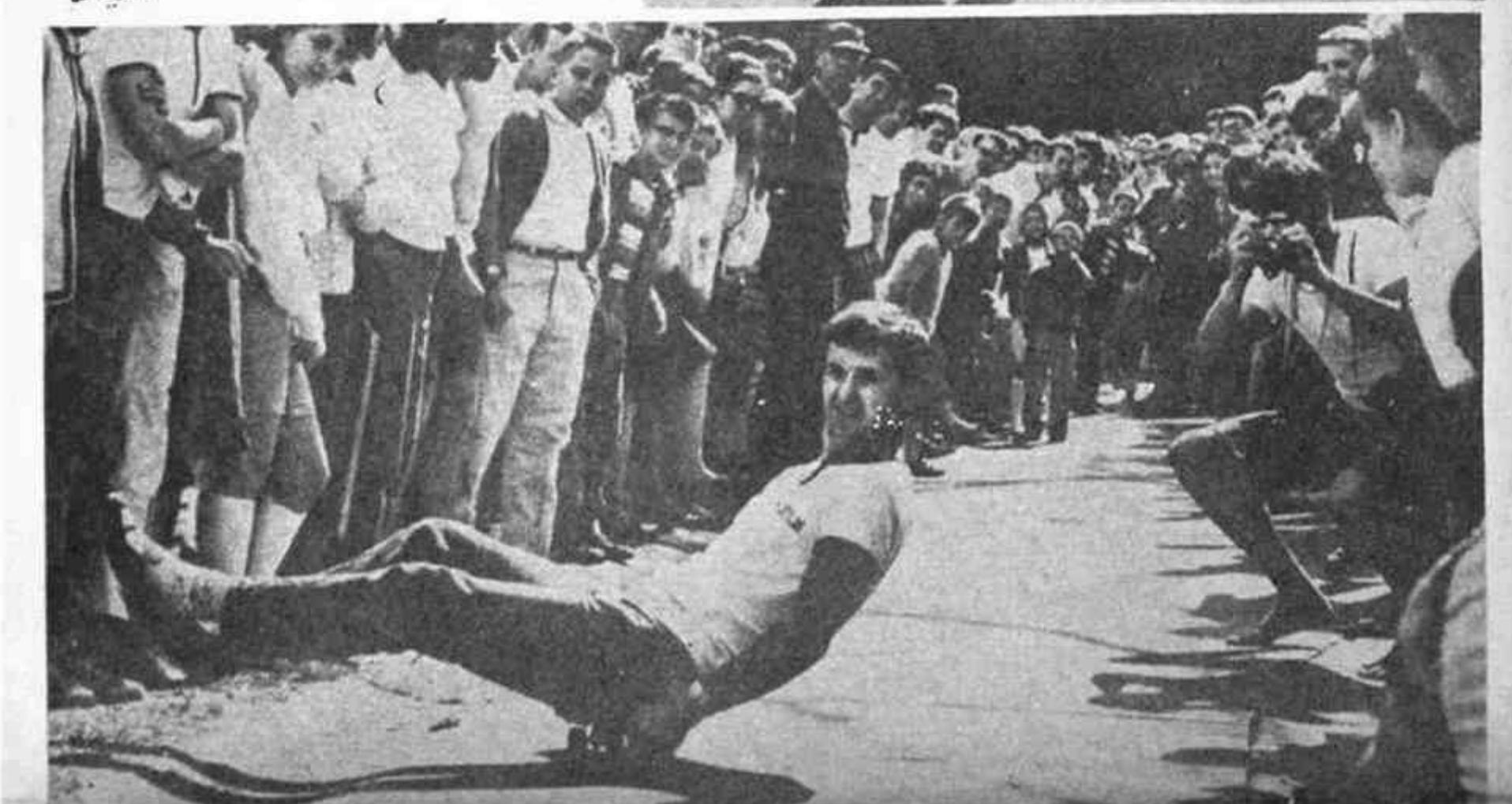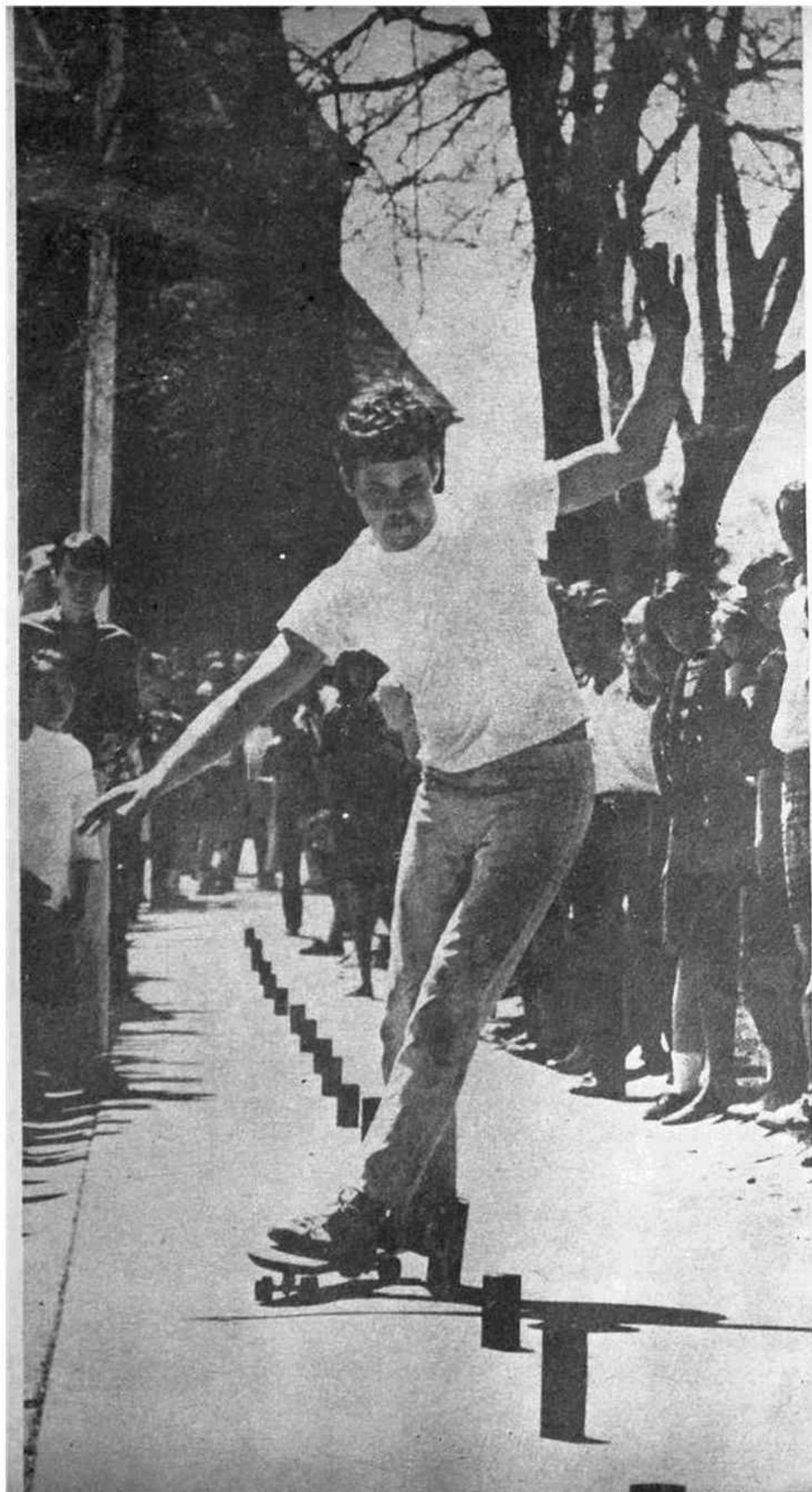
اس نوجوان نے سڑک پر ڈبے
رکھ کر ان کے درمیان کے آڑے
ترچھے راستے سے گزرنے
کا تماشہ دکھایا
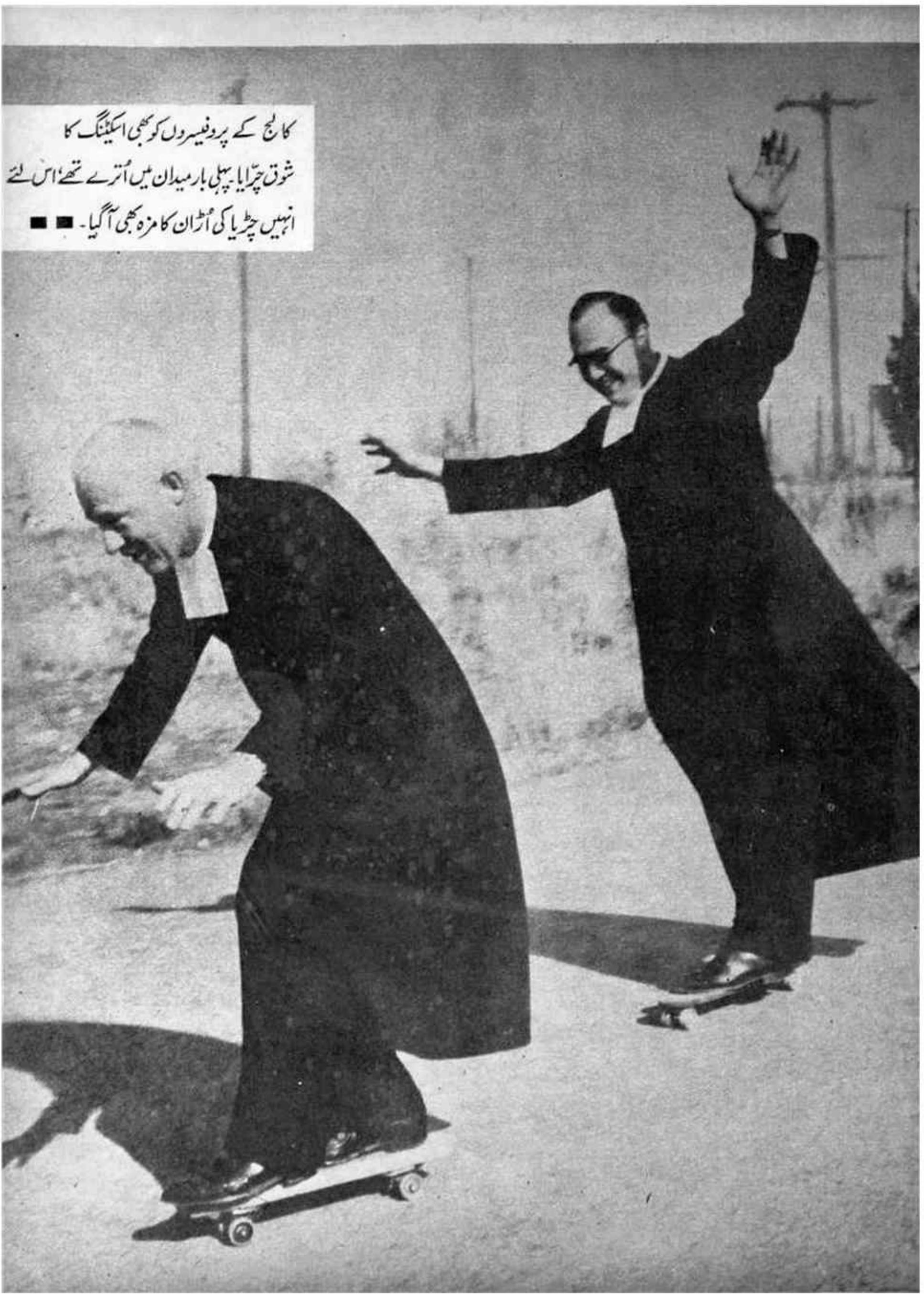
کالج کے پروفیسروں کو بھی اسکیٹنگ کا
شوق چرّایا۔ پہلی بار میدان میں اُترے تھے، اس لئے
انہیں چڑیا کی اُڑان کا مزہ بھی آگیا۔ ■ ■

دو
دوست

لڑکپن کی یاد

شمیم کرہانی
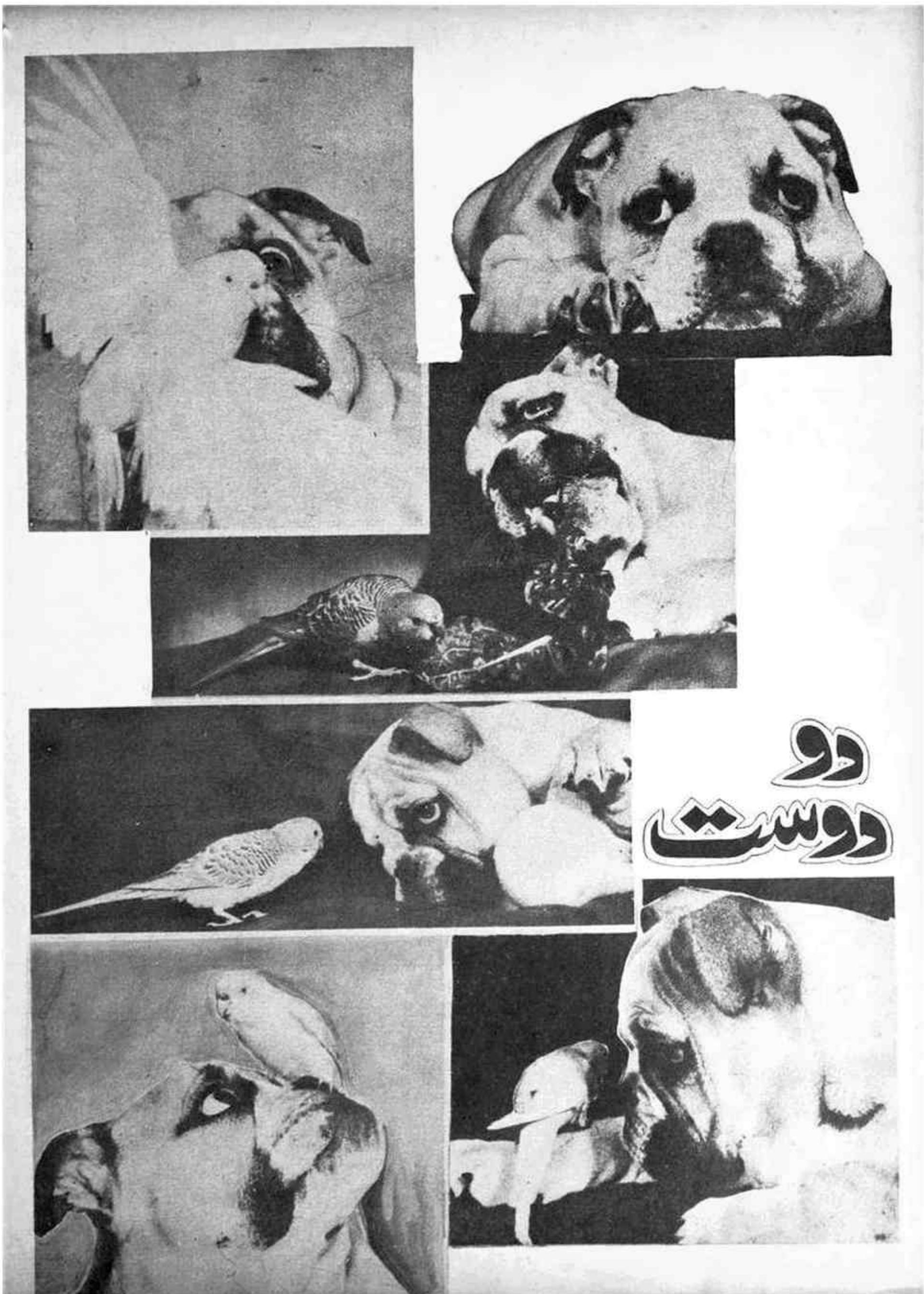
تو مجھ کو ہمنشیں! اپنا لڑکپن یاد آتا ہے
کبھی خالی کلاسوں میں جو بچّے غل مچاتے ہیں
کبھی انجان شاعر کی غزل مِل جُل کے گاتے ہیں
خوشی سے ناچتے ہیں، ڈسک پر طبلہ بجاتے ہیں
تو مجھ کو ہمنشیں! اپنا لڑکپن یاد آتا ہے

ہوا کرتی ہے جب چھٹّی تو چنچل سر پھرے خود سر
لئے ہاتھوں میں بستے، مارتے فٹ بال کو ٹھوکر
اُچھلتے کودتے بچّے نظر آتے ہیں سڑکوں پر
تو مجھ کو ہمنشیں! اپنا لڑکپن یاد آتا ہے

کبھی اِس شاخ سے اُس شاخ پر بچّے اُچھلتے ہیں
کبھی شاخوں پہ جھُولے ڈال کر ظالم مچلتے ہیں
سماں یہ دیکھ کر ماں باپ کے سینے دہلتے ہیں
تو مجھ کو ہمنشیں! اپنا لڑکپن یاد آتا ہے

کوئی شاگرد جب ساتھی کو اپنے گدگداتا ہے
وہ ساتھی ہو کے عاجز سامنے فریاد لاتا ہے
کلاس اس بے بسی پر چُھپکے چُھپکے مُسکراتا ہے
تو مجھ کو ہمنشیں! اپنا لڑکپن یاد آتا ہے

ہزاروں شوخیاں ہوتی ہیں بچپن کے زمانے میں
چبھو کر پِن کوئی بچّہ کسی بچّے کے شانے میں
ہوا کرتا ہے جب مشغول طنزاً مُسکرانے میں
تو مجھ کو ہمنشیں! اپنا لڑکپن یاد آتا ہے

پرشیا کی شہزادی ماریا این
اپنی تمام عمر رات کو کبھی نہیں
سوئی، وہ سورج نکلنے کے
بعد خواب گاہ جاتی تھی۔

عجیب و غرایب عورتیں

وائٹ کا جون اسٹین فوج میں
سپاہی بطور سات مرتبہ زخمی ہوا تین
مرتبہ گرفتار ہوا لیکن ۴۲ سال کی عمر
تک اس کی ماں کے علاوہ دنیا میں
کسی کو حدیہ ہے کہ اس کے باپ کو بھی
یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ مرد نہیں عورت ہے

ازابیل ڈیوٹو دنیا کی پہلی خاتون
گورنر تھی۔ اپنے شوہر کی عدم موجودگی
میں تین سال تک وہ کیوبا میں
اسپینی گورنر بطور کام کرتی رہی

۱۸۱۹ میں این واٹر ہاؤس کو
سولہ سال کی عمر میں ریشم کے
ایک معمولی کپڑے کے چوری کے
الزام میں پھانسی کی سزا ملی تھی اس
کپڑے کی قیمت صرف ۵ ڈالر تھی۔

روحوں کی آوازیں

ابرار محسن

مدتیں گزریں، ایک جاپانی کسی دُور دراز مقام کی طرف پیدل جا رہا تھا۔ شام کے دھندلکے پھیلنے لگے تھے اور رات دور نہ تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔ بے تحاشہ جاڑا پڑ رہا تھا۔ دور دور تک کسی آبادی کا نام ونشان نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد برف باری بھی ہونے لگی۔ مسافر پریشان تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے؟ برفانی رات میں بھٹکتے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ سخت پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ ذرا سی دیر ہی میں اندھیروں کا راج ہوگیا تھا۔ برف باری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سردی کا یہ حال تھا کہ مسافر کے سارے بدن میں کپکپی طاری تھی۔ اچانک اسے دور کہیں روشنی کی کرن نظر آئی اور وہ اسی طرف تیز تیز قدم بڑھانے لگا۔ قریب پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ ایک چھوٹی سی کھڑکی سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ عمارت کا دروازہ بند تھا۔ شاید وہ کوئی سرائے تھی۔

مسافر نے دروازہ پر دستک دی۔

"کون؟" اندر سے آواز آئی۔

"ایک مسافر جو رات بھر سر چھپانے کے لیئے جگہ چاہتا ہے۔" مسافر نے کہا۔

دروازہ کھلا اور ایک بوڑھے نے سر نکال کر کہا "اندر چلے آؤ۔"

مسافر جلدی سے اندر داخل ہوگیا۔ بوڑھے کے ہاتھ میں شمع تھی۔

کمرے کا نمبر کون سا ہے، پانچ منٹ ہوگئے ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے؟

"برف کا طوفان آیا ہوا ہے"۔ بوڑھا بڑبڑا رہا تھا۔

"ہوں۔ ہاں۔" مسافر نے کپکپاتے ہوئے کہا اور کپڑوں پر سے برف جھڑانے لگا۔

بوڑھے نے شمع ایک اسٹول پر رکھ کر مسافر پر نظر ڈالی اور کہا "تم کانپ رہے ہو۔ ٹھہرو۔ اِدھر آتش دان کے پاس آکر بیٹھ جاؤ۔"

مسافر آتش دان کے نزدیک بیٹھ گیا۔ آگ کی گرمی نے اس کے تن بدن میں نئی زندگی سی بھر دی۔ اتنے میں بوڑھا اس کے لئے کچھ کھانے کو لے آیا۔

"پچھلے چالیس برس سے ایسی سردی نہیں پڑی"۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔ اور بھائی سردیاں تو ہم سرائے والوں کے لئے مصیبت بن کر آتی ہیں۔ مسافر سفر کرنے کی ہمت ہی نہیں کرتے اور جب مسافر ہی نہ آئیں گے تو سرائے کیا خاک چلے گی۔ ہونہہ۔"

"تو کیا اس وقت بھی سرائے میں کوئی مسافر نہیں ہے؟" مسافر نے سوال کیا۔

بوڑھے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "نہیں میری سرائے بدنام ہو کر رہ گئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں یہاں بھوت رہتے ہیں۔"

مسافر ہنسنے لگا۔ "میں بھوتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ اس نے کہا۔ یقین رکھو میں تمہاری سرائے کو بدنام نہیں کروں گا۔"

مسافر نے کھانا ختم کیا تو کہنے لگا۔ "اب تو آرام کو دل چاہ رہا ہے۔ دن بھر کے سفر سے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ کوئی کمبل تو ہوگا تمہارے پاس؟"

ہاں ہے ایک۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ "کچھ مسافروں کے پاس اوڑھنے کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے لئے ہی رکھ چھوڑا ہے۔ ابھی لاتا ہوں۔ تم برابر والے کمرے میں سو جانا۔"

مسافر اٹھ کر برابر والے کمرے میں چلا گیا۔ اتنے میں بوڑھا ایک بوسیدہ کمبل لے آیا۔

"شب بخیر۔ مسافر نے کمبل اوڑھتے ہوئے کہا۔ "صبح پو پھٹنے سے پہلے ہی اٹھا دینا۔ ابھی میری منزل بہت دور ہے۔"

شاید آدھی رات گذر چکی تھی کہ اچانک مسافر کی نیند اُچٹ گئی۔ کچھ عجیب قسم کی آوازیں کہیں نزدیک سے آرہی تھیں۔ اس نے غور سے سُنا۔ دو بچوں کی آوازیں تھیں۔

"بھیا کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟"

"ہاں بھیا، بہت لگ رہی ہے۔"

مسافر نے سوچا شاید برابر والے کمرے سے وہ آوازیں آرہی ہوں۔ مگر وہاں تو بوڑھے کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ اٹھ کر دبے پاؤں بوڑھے کے کمرے کی طرف آیا۔ بوڑھا فرش پر بے سُدھ سو رہا تھا۔

ہو سکتا ہے میرا وہم ہو۔ مسافر بڑبڑایا اور آکر پھر کمبل لپیٹ کر لیٹ گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پھر وہی آوازیں آنے لگیں، جیسے دو ننھے بچے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں:۔

"بھیا، کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟"

"ہاں بھیا، بہت لگ رہی ہے۔"

مسافر بوکھلا کر پھر اٹھ بیٹھا۔ آوازیں بالکل ہی نزدیک سے آرہی تھیں۔ اور پھر اس کا دل مارے خوف کے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سخت سردی کے باوجود اس کا چہرہ پسینے سے تر ہوگیا۔

آوازیں بدستور آرہی تھیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے کمبل میں سے بول رہا ہو۔ اس نے کمبل الٹ دیا۔ وہاں تھا ہی کیا۔

مگر اسے یقین تھا وہ آوازیں کمبل ہی میں سے آرہی تھیں۔

مسافر جھلا کر بوڑھے کے کمرے میں گیا اور اسے جھنجھوڑنے لگا، "بڑے میاں، اٹھو۔"

"کیا ہے؟" بوڑھے نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

یہ سب کیا ہے؟ مسافر نے غصّے سے کہا۔ کمبل میں سے آوازیں کیسی آرہی ہیں۔ میں بھوتوں کو نہیں مانتا۔ مگر یہ میرے کانوں کا دھوکا نہیں، بلکہ حقیقت ہے۔"

بوڑھا غور سے مسافر کو دیکھ رہا تھا۔

"بتاؤ میں اسے کیا سمجھوں؟ مسافر کہہ رہا تھا۔ میری نیند خراب ہو گئی ہے۔ یہ آوازیں مجھے سونے نہیں دیتیں۔" یہ آوازیں کسی مسافر کو بھی یہاں سونے نہیں دیتیں۔ بوڑھے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ان ہی کی وجہ سے لوگوں نے یہاں ٹھہرنا ختم کر دیا ہے۔"

"تو تم ان آوازوں سے واقف ہو؟"

"ہاں، خوب اچھی طرح" بوڑھے نے جواب دیا۔ "مگر میں دوسرا کمبل نہیں خرید سکتا۔ میں بہت غریب ہوں۔"

"تو وہ آوازیں کمبل ہی میں سے آتی ہیں!" مسافر نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ بوڑھے نے جواب دیا۔" اور ان آوازوں کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔"

"عجیب بات ہے۔" مسافر بڑبڑایا۔ لیکن آخر ان آوازوں کا کیا راز ہے؟"

"یہ ایک درد بھری کہانی ہے۔ سنو گے؟"

"ہاں ہاں ضرور۔" مسافر نے بے حد دلچسپی کا اظہار کیا۔

"تو سنو۔" بوڑھے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہنا شروع کیا۔ "یہاں سے تھوڑی دور پر ایک گاؤں ہے جس میں کبھی دو معصوم بچے ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں رہا کرتے تھے۔ دونوں کم سن تھے اور یتیم تھے۔ اس دنیا میں ان کا کوئی بھی نہ تھا۔ بے چارے نہ جانے کس کس صورت سے زندگی گذار رہے تھے۔ دونوں بھائیوں میں پیار بہت تھا۔ ایک دوسرے کے پیچھے سائے کی طرح لگا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ بالکل ایسی ہی بھیانک رات تھی۔ برف پڑ رہی تھی۔ دونوں بھائی کمبل میں لپٹے ہوئے لیٹے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے:-

"بھیّا کیا تم کو سردی لگ رہی ہے؟"

"ہاں بھیّا، بہت لگ رہی ہے۔"

اسی وقت جھونپڑی کا مالک آیا اور گرج کر کہنے لگا، کتنے دن ہو گئے اور تم نے جھونپڑی کا کرایہ نہیں ادا کیا۔ چلو نکلو یہاں سے بچے سہم کر کھڑے ہو گئے۔

"رحم کرو۔" انہوں نے کہا۔ "رات کا وقت ہے۔ برف پڑ رہی ہے۔ ہم کہاں جائیں گے بھلا؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" ظالم نے کہا "چلو۔ باہر نکلو۔ ابھی اسی وقت۔" اس نے کمبل چھین کر دونوں معصوموں کو باہر نکال دیا۔ ساری رات وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے باہر برف میں کھڑے رہے۔ اگلی صبح ان کی اکڑی ہوئی لاشیں برف میں دبی ہوئی پائی گئیں۔

"بچے مر گئے مگر ان کی آوازیں کمبل میں بس کر رہ گئی ہیں۔"

"تو یہ وہی کمبل ہے؟" مسافر نے پوچھا۔

بوڑھے نے کہا "جھونپڑے کے مالک نے اس کمبل کو بازار میں بیچ دیا تھا اور میں اسے سستا سمجھ کر خرید لایا۔ مگر جو بھی مسافر سے اوڑھتا ہے، صبح ہوتے ہی بھاگتا جھکتا چلا جاتا ہے اور طیش کی وجہ سے مجھے ایک پیسہ تک نہیں دیتا۔" بوڑھا خاموش ہو گیا۔ مسافر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"بڑی درد بھری کہانی ہے!" مسافر نے بوڑھے سے کہا۔

رات کی سیاہی چھٹنے لگی تھی۔ صبح کا نور دھیرے دھیرے بکھر رہا تھا۔ مسافر نے بوڑھے کے ہاتھ پر چند سکّے رکھے اور سفر پر روانہ ہو گیا۔

●●

ایک ٹکٹ میں دو مزے،
جھولے بھی اور کرکٹ کا
میچ بھی دیکھئے

احمق اعظم

م۔ ندیم

یہ بات صدیوں پہلے کی ہے۔ ہندوستان کے ایک حصّہ پر ایک راجہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے گھر بہت دعاؤں کے بعد ایک خوب صورت راج کماری کا جنم ہوا۔ اس کی خوب صورتی کو دیکھتے ہوئے اس کا نام چندر مکھی رکھا گیا۔ راجہ نے اس کو بڑے بڑے عالموں سے تعلیم دلوائی۔ راج کماری بہت ذہین تھی جلد ہی وہ سارے علوم میں ماہر ہو گئی۔ جب وہ جوان ہوئی تو راجہ کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، کیوں کہ راج کماری نے جو اپنے زمانے کے بڑے بڑے پنڈتوں سے بحث کرتی تھی اور سارے علوم میں ماہر تھی اپنے باپ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اسی راج کمار سے شادی کرے گی جو نہ صرف یہ کہ بہادر اور خوب صورت بھی ہو بلکہ علم میں اس سے بڑھ چڑھ کر بھی ہو۔

راجہ نے پاس پڑوس کے راج کماروں کو اپنے یہاں بلایا تاکہ چندر مکھی اُن کو دیکھ لے اور ان میں سے کسی کو پسند کر لے چندر مکھی راج کماروں سے چند سوالات کرتی۔ جب ان بے چاروں سے سوالوں کے جواب نہ بن پڑتے تو ان کا مذاق اُڑاتی اور ان کی کمر سے تلوار اور پیر سے جوتے اتروالیتی، یہ اُس کی شرط تھی کہ جو اس سے شکست کھائے گا ننگے پاؤں گھر کو واپس جائے

گا۔ اس طرح کئی راج کمار چندر مکھی کے حسن اور تعلیم کا چرچا سن کر آئے اور اپنی تلواریں اور جوتے ہار کر گئے۔ اس طرح چندر مکھی نے بہت ساری تلواریں اور جوتے اکٹھا کر لیے جن کو اس نے اپنے کمرے میں سجا کر رکھا تھا اور ان کے نیچے ہارنے والے راج کمار کا نام بھی لکھ کر رکھ دیا تھا۔

راجہ کو چندر مکھی کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ سارے پاس پڑوس کے راج کماروں پر اس بات کا چرچا تھا کہ چندر مکھی کو محض تلواریں اور جوتے جمع کرنے کا شوق ہے۔ اب کوئی بھی راج کمار اپنی بے غرتی کے ڈر سے راج کماری کے سامنے جانے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ آخر راجہ نے چندر مکھی کو سمجھایا کہ وہ کسی خوب صورت راج کمار سے شادی کرلے اور اس کھیل سے باز آجائے کہ یہ باتیں لڑکی ذات کو زیب نہیں دیتیں مگر راج کماری نے جواب دیا کہ وہ کسی جاہل کے ساتھ زندگی گذارنے سے بہتر یہ سمجھتی ہے کہ بغیر شادی کے ہی جیون بتائے۔

راجہ دل میں بہت غصّہ ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ چندر مکھی کو اس کے غرور کا بدلہ ملنا ہی چاہیئے۔ چنانچہ اس نے اپنے وزیر کو بلایا اور اس کو سارا حال بتایا اور تاکید کی کہ میری حکومت میں جو شخص سب سے بڑا بے وقوف ہو اس کو لاؤ، میں اس کا بیاہ اس مغرور لڑکی کے ساتھ کر دوں گا تاکہ اس کو غرور کا بدلہ مل جائے۔

چاروں طرف راجہ کے آدمی وزیر کے ساتھ بے وقوف کی تلاش میں نکلے۔ کئی دن تک ان کو کوئی چھوٹا یا بڑا بے وقوف نظر نہ آیا جس کو وہ پکڑ سکتے۔ مگر چونکہ وزیر کو ساری سلطنت میں تلاش کا حکم دیا گیا تھا اس لئے وہ سب اس اُمید میں چلتے رہے کہ اتنی بڑی حکومت میں کوئی نہ کوئی بے وقوف کہیں نہ کہیں ضرور مل ہی جائے گا۔

ایک دن ان کا گذر ایک گاؤں سے ہوا۔ وزیر نے دیکھا کہ ایک آدمی کچھ پکا رہا ہے اس نے ہانڈی ایک پیڑ کی اُونچی شاخ پر باندھ رکھی ہے اور اس کے نیچے آگ جلا رکھی ہے کہ آنچ اس تک نہیں پہنچ سکتی، مگر وہ برابر آگ جلائے جا رہا ہے۔

وزیر نے پوچھا "بھائی یہ کیا تماشہ ہے؟"

"یہ تماشہ نہیں ہے، میں کھچڑی پکا رہا ہوں ——" اُس نے جواب دیا

"مگر تم نے ہانڈی تو آسمان پر باندھ رکھی ہے، میاں وہاں تک تو آگ کی گرمی بھی نہیں پہنچ سکتی۔ بھلا کھچڑی کیسے پک سکتی ہے؟"

"آپ تو عقل کے پتلے ہیں .... ہانڈی کاٹھ کی ہے، اگر آگ پر رکھوں گا تو جل جائے گی، آج ہی خریدی ہے۔ مجھے جناب" اس نے جواب دیا۔

"واہ .... یہ ملا ہے احمق ...." وزیر نے دل میں کہا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس کو مع اس کی کاٹھ کی ہانڈی کے پکڑ کر باندھ دیں تاکہ بھاگنے نہ پائے۔"

آگے چل کر ان کو ایک ندی پار کرنا تھی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی بڑی دیر سے ندی سے ایک ایک لوٹا پانی بھرتا ہے اور اُسے خشک ریت پر انڈیل دیتا ہے۔

وزیر نے اس سے پوچھا "میاں یہ کیا کر رہے ہو؟"

"جناب میرا سونے کا ٹکا آج صبح ندی پار کرتے وقت اس میں گر گیا تھا، میں ندی خالی کر رہا ہوں تاکہ میرا ٹکا مل جائے۔"

وزیر نے کہا "میرا خیال ہے یہ پہلے سے بڑا احمق ہے۔" چنانچہ پہلے والے احمق کو رہا کر دیا گیا اور دوسرے کو پکڑ لیا۔

دوسرے دن ان کا گذر ایک شہر سے ہوا۔ شہر پناہ کے دروازے بند تھے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ شہر کوتوال کا ایک کبوتر کہیں غائب ہو گیا ہے۔ شہر پناہ کے دروازے اس لئے بند ہیں تاکہ کبوتر اس دروازے سے نہ نکل سکے۔ یہ کوتوال صاحب کا حکم ہے۔

"واہ .... کیا بات ہے .... یعنی کبوتر نہ ہوا، گائے بکری ہوئی، کبوتر کے پر ہوتے ہیں، وہ کدھر ہی سے اُڑ کر نکل سکتا ہے ....." وزیر دل میں بہت خوش ہوا اور شہر کوتوال کو گرفتار کرکے پہلے والے احمق کو رہا کر دیا۔

واپسی پر اُن کا گذر ایک جنگل سے ہوا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ ایک شخص پیڑ کی اونچی شاخ پر بیٹھا کلہاڑی سے اسی شاخ کو کاٹ رہا ہے جس پر کہ بیٹھا ہے۔

"ارے واہ۔ میں تو ایک بے وقوف انسان کی تلاش میں نکلا تھا۔ اِس دنیا میں تو ایک سے ایک بڑا احمق ہے۔" وزیر نے کہا اور اس نئے احمق کو گرفتار کرکے سیدھا راجہ کے سامنے پیش کیا اور اس کی حماقت بھی بیان کر دی، راجہ بہت خوش ہوا اور وزیر سے کہا "میں تمہاری تلاش و جستجو کی تعریف کرتا ہوں۔ یہ احمق ترین شخص ہے بلکہ احمقِ اعظم ہے۔ راج کماری سورج مکھی کے غرور کو توڑنے کے لئے یہی شخص مناسب ہے۔"

اس شخص سے بہت کچھ پوچھنے کی کوشش کی گئی مگر وہ گم صم بنا رہا، ایسا لگتا تھا وہ بولنا جانتا ہی نہیں ہے۔

اس کو راج کماروں کا بہترین لباس پہنایا گیا جو اس کے جسم پر خوب بجتا تھا۔ وہ اس سج دھج میں سچ مچ کا راج کمار لگتا تھا۔ اس کے سنجیدہ چہرے سے وقار ٹپکتا تھا۔

راجہ نے چندر مکھی سے نئے راج کمار کی بہت تعریف کی اور کہا "میرا خیال ہے اب تم کو موزوں راج کمار ملا ہے۔ یہ ہمارے قریب کی ریاست کا بڑا ہی عالم راج کمار ہے۔ اس کا نام ودیا ساگر راج کمار ہے۔ جیسا اس کا نام ہے وہ حقیقت میں ویسا ہی ہے۔ اس سے بڑا عالم و فاضل ہماری ساری سلطنت میں کیا شاید دنیا میں نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے تم اس کو اپنا جیون ساتھی ضرور چن لوگی۔"

راج کماری، راج کمار کی تعریف سن کر بہت مرعوب ہوئی۔

ویٹر! میرے شوربے میں یہ ایک بال اور نکلا ہے!

اور جب نقلی راج کمار اس کے سامنے آیا تو اس کی سج دھج اور سنجیدہ عالمانہ صورت دیکھ کر اس پر بہت رُعب پڑا۔ اس نے سُنا تھا جو انسان جتنا قابل ہوتا ہے اتنا ہی وہ سنجیدہ اور کم سخن ہوتا ہے۔ بالکل سمندر کی طرح جو گہرا ہونے کے باوجود شور نہیں کرتا، مگر اُتھلے ندی نالے کرتے ہیں۔ واقعی یہ راج کمار ودیا ساگر (علم کا سمندر) ہے۔

نقلی راج کمار خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے کوئی فکر یا پریشانی کے آثار نمایاں نہ تھے۔ راج کماری سورج مکھی نے اس کو دل و جان سے پسند کیا، پھر بھی اس کا امتحان لینا ضروری سمجھا اور کہا ـــــ "ودیا ساگر راج کمار جی میرے تین سوال ہیں خاموش سوال .... اُن کے خاموش جواب چاہئیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک انگلی اس کو دکھائی ....

راج کمار نے جھٹ دو انگلیاں راج کماری کو دکھلائیں۔

پھر راج کماری نے دائیں ہاتھ کی پانچ انگلیاں اس کو دکھلائیں۔ راج کمار نے مٹھی بند کرکے راج کماری کو دکھلائی۔ تب راج کماری نے قریب رکھی ہوئی جلتی موم بتی اُٹھا کر اس کے چہرے کے قریب کر دی۔ راج کمار نے اس کو پھونک مار کر بجھا دیا۔

راج کماری مصنوعی راج کمار کے قدموں پر گر پڑی اور بولی "واقعی آپ بہت بڑے عالم ہیں۔" اسی وقت راجہ نے راج کماری کی شادی اس مصنوعی عالم سے کر دی۔

تب راجہ نے راج کماری سے کہا "بیٹی چندر مکھی تم بہت قابل بنتی تھیں آخر دھوکا کھا گئیں۔ جس شخص سے تمہاری شادی ہوئی ہے وہ ہماری سلطنت کا احمق ترین انسان ہے۔ تم کو تمہارے قصور کا بدلہ مل گیا۔

"مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ تو بہت بڑا عالم ہے میں نے اس کا امتحان لیا ہے۔ میں نے اس کو ایک انگلی دکھائی . . . . میرا مطلب تھا کہ میں تنہا زندگی گذارنا چاہتی ہوں۔ اس نے دو انگلیاں دکھلائیں کہ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں یعنی اس نے اشارتاً اپنے آپ کو پیش کیا۔ میں نے اس کو پانچ انگلیاں دکھلائیں۔ میرا سوال تھا کہ وہ پانچ کون سی قوتیں ہیں جو انسان کی زندگی کے رشتے کو بنائے رکھتی ہیں۔ اس نے مٹھی بند کر کے دکھلائی اس کا جواب تھا کہ وہ پانچوں حواس ہیں اور ان پر قابو رکھ کر انسان کی زندگی کامیاب اور وہ صحت مند رہ سکتا ہے۔ تب میں نے اس سے تیسرا اور آخری سوال کیا۔ میں نے جلتی ہوئی شمع اس کے سامنے کی، میرا مقصد تھا کہ انسان کی زندگی اس شمع کے مانند ہے مگر وہ کون سی چیز ہے جو اس کو بجھا دیتی ہے۔ تب اس نے اس شمع کو پھونک مار کر بجھا دیا اور یہ بتایا کہ موت ایک ہوا کے جھونکے کی مانند ہے جو کسی وقت بھی شمع حیات گل کر سکتا ہے"۔

تب راجہ بہت ہنسا اور بولا . . . . " وہ تو نرا احمق ہے۔ بھلا اس کے ذہن میں نہ تو تمہارے سوالات آئے اور نہ اپنے جوابات . . . . تم نے اس کو ایک انگلی دکھائی تھی وہ سمجھا کہ شاید تم اس کی ایک آنکھ پھوڑنے کی دھمکی دے رہی ہو، اس نے تم کو دو انگلیاں دکھائیں یعنی اس نے جوابی دھمکی دی کہ وہ دونوں آنکھیں پھوڑ سکتا ہے۔ تم نے پانچ انگلیاں دکھائیں، وہ سمجھا کہ تم اس کو تھپڑ مارنے کی دھمکی دے رہی ہو۔

چنانچہ اس نے جواب میں گھونسا تان دیا کہ وہ تھپڑ کا جواب گھونسے سے دے گا . . . . اور آخر میں تم نے جلتی ہوئی شمع اس کے سامنے کی وہ سمجھا کہ تم اس کی مونچھیں جلانا چاہتی ہو سو اس غریب نے گھبرا کے پھونک ماری اور اسے بجھا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نرا جاہل ہے۔ جو شخص جس شاخ پر بیٹھا ہو اسی کو کلہاڑی سے کاٹے، اس کی حماقت میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے"۔

راج کماری یہ سن کر بہت غصہ ہوئی اور پچھتائی . . . . اور اس نے اپنے مصنوعی عالم شوہر کو سپاہیوں کے حوالے کیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ اس جاہل کو کسی اندھے کنوئیں میں ڈال آئیں کہ جاہلوں کا ٹھکانا تاریکی ہے۔

سپاہی اس بے چارے کو ایک جنگل کے کنوئیں میں ڈال آئے۔ وہاں پڑا پڑا وہ مدد کے لئے پکارتا رہا، چلاتا رہا مگر کسی نے نہ سنا۔ اتفاق سے اِدھر سے علم کی دیوی کا گذر ہوا اس نے اس کی آہ و زاری سن کر اُسے کنوئیں سے باہر نکالا۔ مصنوعی عالم نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں ساری کہانی سنائی کیوں کہ صحیح طریقے سے بول بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تقریباً گونگا تھا۔ علم کی دیوی کو اس پر رحم آگیا اور اس نے اس کو بشارت دی کہ وہ بہت بڑا عالم ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔ تب اس مصنوعی عالم کی زبان درست ہوگئی . . . . اور اس نے کئی سال سخت محنت اور ریاضت کر کے علم حاصل کرنے میں گذارے۔ یہاں تک کہ اس کے علم کا چرچا دور دور سارے ملک میں پھیل گیا۔ تب وہ عالم ایک بار راج کماری چندر مکھی کے دربار میں اس سے بحث کرنے آیا اور اس کو شکست دی اور اس سے بیاہ کیا . . . . چندر مکھی کو جب پتہ چلا کہ یہ وہی اس کا شوہر ہے جس کو اس نے کنوئیں میں قید کرایا تھا اور کس طرح علم کی دیوی اس پر مہربان ہوئی تھی تو وہ بہت شرمندہ ہوئی۔ کہتے ہیں یہ مشہور عالم شخص بعد میں "کالی داس" کے نام سے مشہور ہوا جس کا مشہور ڈرامہ "شکنتلا" دنیا کی تقریباً ساری زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ جس کو تم نے بھی پڑھا ہوگا۔ ●●

جولیانا

علقمہ شبلی

(ایک ویٹ نامی سپاہی کی نعش پر اس کے معصوم بچے جولیانا کو آنسو بہاتے دیکھ کر)

مرے جولیانا!
تجھے غم ہے شاید
دکھوں کے بھرے اس جہاں میں
کوئی بھی ترا آج اپنا نہیں ہے
نگاہوں میں کوئی بھی سپنا نہیں ہے

مگر، جُولیانا!
بہا تو نہ آنسو
ترے غم میں روتا ہے ہر دل
ترے ساتھ نم چشمِ افریشیاؔ ہے
ترا درد، دردِ جہاں بن گیا ہے

امر ہو گیا ہے
ترا باپ مر کر
نہ بھولے گا اس کو زمانہ
سدا یاد بن کر دلوں میں رہے گا
رہے گا لبوں پر بھی اس کا فسانا

حقیقت سے بڑھ کر
فسانہ ہے اس کا
زمانے میں اس کے لہو سے
ہے رنگیں وطن دوستی کی کہانی
ملی ہے وطن کو نئی زندگانی

تری مُسکراہٹ
تھی آئینہ گویا
نظر آتا تھا جس میں اُس کو
جواں سال و شاداب دُنیا کا نقشہ
حسیں اور خوش حال فردا کا نقشہ

ہے اک پھول تُو بھی
اِسی گُلستاں کا
تری آنکھ میں کیوں ہیں آنسو
سپاہی بنے گا تُو اپنے وطن کا
محافظ بنے گا تُو اپنے چمن کا

ہو لب پر تبسّم
اُمنگیں ہوں دل میں
"جہاں دوستی" ہو نظر میں
ہے ویٹ نام کو بس ضرورت اِسی کی
بڑی چیز ہے مُسکراہٹ کِسی کی

نئے ارادے۔ نئی منزلیں

الیاس خورشید
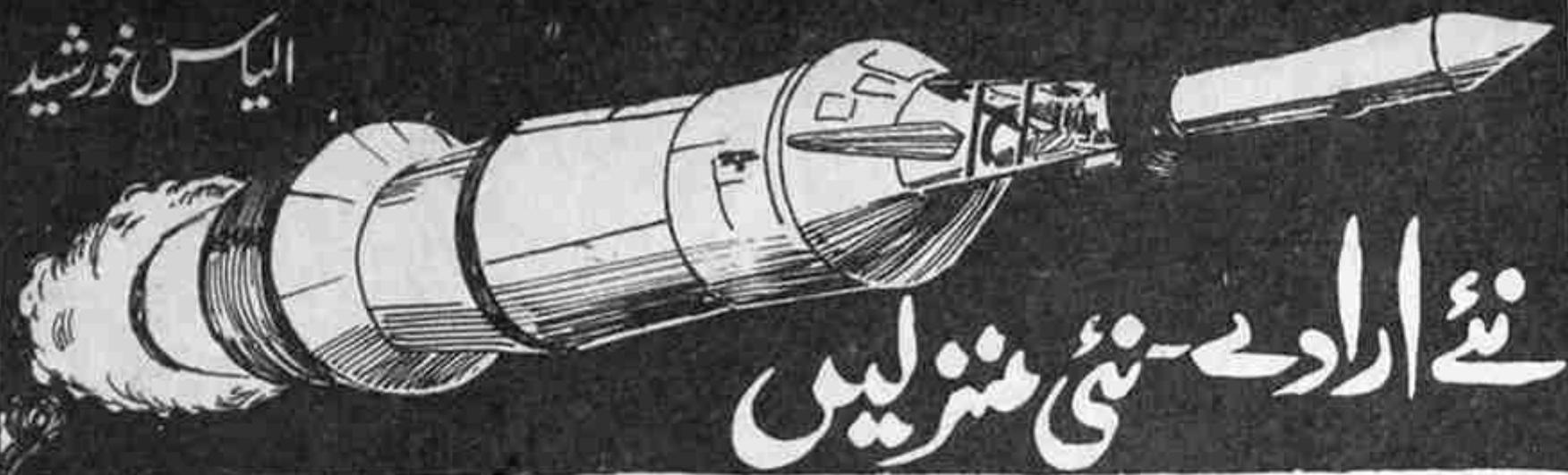
آج کے دَور کا مقابلہ اگر پتّھر کے زمانے سے کیا جائے تو زمین اور آسمان سے بھی زیادہ کا فرق نظر آئے گا۔ کل کا انسان وحشی تھا اور جانوروں کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔ پہاڑوں کے غار اس کے رین بسیرا تھے۔ کچّا گوشت، جنگلی پھل اور جڑی بوٹیوں سے وہ اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ ننگ دھڑنگ گھومنا اس کے لئے کوئی شرم کی بات نہ تھی۔ وہ تہذیب و تمدّن سے کوسوں دُور تھا۔ آج کا انسان کل کے اُس انسان سے بالکل مختلف ہے۔ آج وہ وحشی نہیں رہا ہے، بلکہ مہذّب ہوگیا ہے۔ وہ غاروں کی بجائے اب سمنٹ اور کانکریٹ کی پختہ عمارتوں میں رہتا ہے۔ کچّا گوشت اب اس کی غذا نہیں رہی ہے، بلکہ اب وہ طرح طرح کے لذیذ پکوان کھاتا ہے اور اپنی تن پوشی کے لئے عمدہ اور بہترین قسم کے کپڑوں کا استعمال کرتا ہے۔ آج تہذیب و تمدّن اس کی مٹھی میں ہے۔ وہ جدھر چاہے ان کا رُخ موڑ دے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام ترقی انسانی ذہن و فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ انسانی ذہن ہی کا کرشمہ ہے کہ دنیا آج کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ زمین پر اس کا طوطی بول رہا ہے، ہَوا پر اس کی حکمرانی ہے۔ اس نے سمندر کا سینہ چیر دیا ہے اور اب اس کی گہرائیوں کو کھنگال رہا ہے۔ چرند، پرند اور درندے اس کے مطیع اور فرماں بردار ہیں۔ اب اس کی نظریں آسمان پر لگی ہوئی ہیں۔ اب وہ چاند ستاروں پر کمند پھینک رہا ہے اور خلا کے پُراسرار حالات جاننے کی جستجو میں ہے۔ اب اس کی توجہ خلائی پرواز پر ہے۔

خلائی اُڑان کا خیال نیا نہیں ہے، بلکہ یہ اُس وقت سے انسان کے ذہن میں بسا ہوا ہے جب سے اس نے ہوش کے ناخن لئے ہیں۔ خلائی پرواز نے انسانی ادب میں بھی اچھا خاصا مقام پیدا کیا ہے۔ فرانس کے مشہور مصنّف جولزورن (JULES VERNE) نے اپنے تقریباً تمام ناول خلا کے متعلق لکھے ہیں اور اس نے خلائی جہاز تو کیا، پوری ریل گاڑی تک کو خلا میں پہنچا دیا ہے۔ ہمارے جاسوسی ادب کے مصنّفوں نے تو جولزورن کے بھی کان کاٹ لئے ہیں۔ ان کے کرداروں کے لئے تو مریخ، زہرہ اور دوسرے نامعلوم سیّاروں کا سفر کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ دُور دراز کے ستارے اور سورج اب ان کے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ وہ انسان کو لہروں میں تبدیل کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے ہیں۔ اگر کوئی قاتل قتل کرنے کے بعد کسی ایسے سیّارے پر پہنچ جائے جو زمین سے پانچ نوری سال کے فاصلے پر ہو تو جاسوس صاحب بھی فوراً تیز ترین اُڑنے والے راکٹ کے ذریعے اُس تک پہنچ جائیں گے اور قاتل کو مع ثبوت گرفتار کر کے زمین پر لے آئیں گے۔

مگر یہ سب محض خیال آرائی ہے۔ حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے ختم ہونے کے بعد خلائی پرواز اور خلائی چھان بین کے خیال نے شدّت اختیار کر لی۔ اس میدان میں سب سے پہلے امریکہ اور روس اُترے اور فی الحال ان دونوں ملکوں کے درمیان خلائی دوڑ کا مقابلہ جاری ہے اور ان کی منزل چاند ہے۔ چند سال پہلے دنیا کے لوگ صرف امریکہ کے خلائی پروگرام سے واقف تھے اور آہنی پردے والے ملک روس میں کیا ہو رہا تھا، یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ ہاں صرف یہ

خبر تھی کہ روس بھی خلائی پرواز کی تیاریاں کر رہا ہے۔ تفصیلات کا علم کسی کو نہ تھا۔ اس دوران میں امریکہ نے کئی خلائی تجربے کیے اور ناکام رہا۔ ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ روسی سائنس دانوں نے اسپوتنک (SPUTNIK) نامی ایک مصنوعی سیّارہ خلا میں داغ دیا ہے۔ اسپوتنک انسان کا بنایا ہوا پہلا سیارہ تھا جس نے ۴۔ اکتوبر، ۱۹۵۷ کو زمین کے گرد چکّر لگائے۔ اس کے فوراً بعد یعنی ۳ نومبر، ۱۹۵۷ کو روس نے لائیکا (LAIKA) نامی ایک کُتیا کو خلا میں پہنچا دیا۔ مگر لائیکا کو زمین پر واپس نہ لایا جا سکا، کیوں کہ پرواز کے بعد زمین کی فضا میں کسی کی واپسی کا مسئلہ ابھی تک حل طلب تھا۔ چنانچہ لائیکا نے اپنے خلائی جہاز سمیت خلا کی وسعتوں میں دم توڑ دیا۔ پھر ۱۹۔ اگست ۱۹۶۰ کو روسیوں نے ایک پانچ ٹن وزنی خلائی جہاز میں بیلکا (BELKA) اور اسٹریلکا (STRELKA) نامی دو کُتوں اور چند چُوہوں کو خلا میں پھینکا اور ان کو زمین پر اُتار بھی لیا۔ اس طرح روسی سائنس
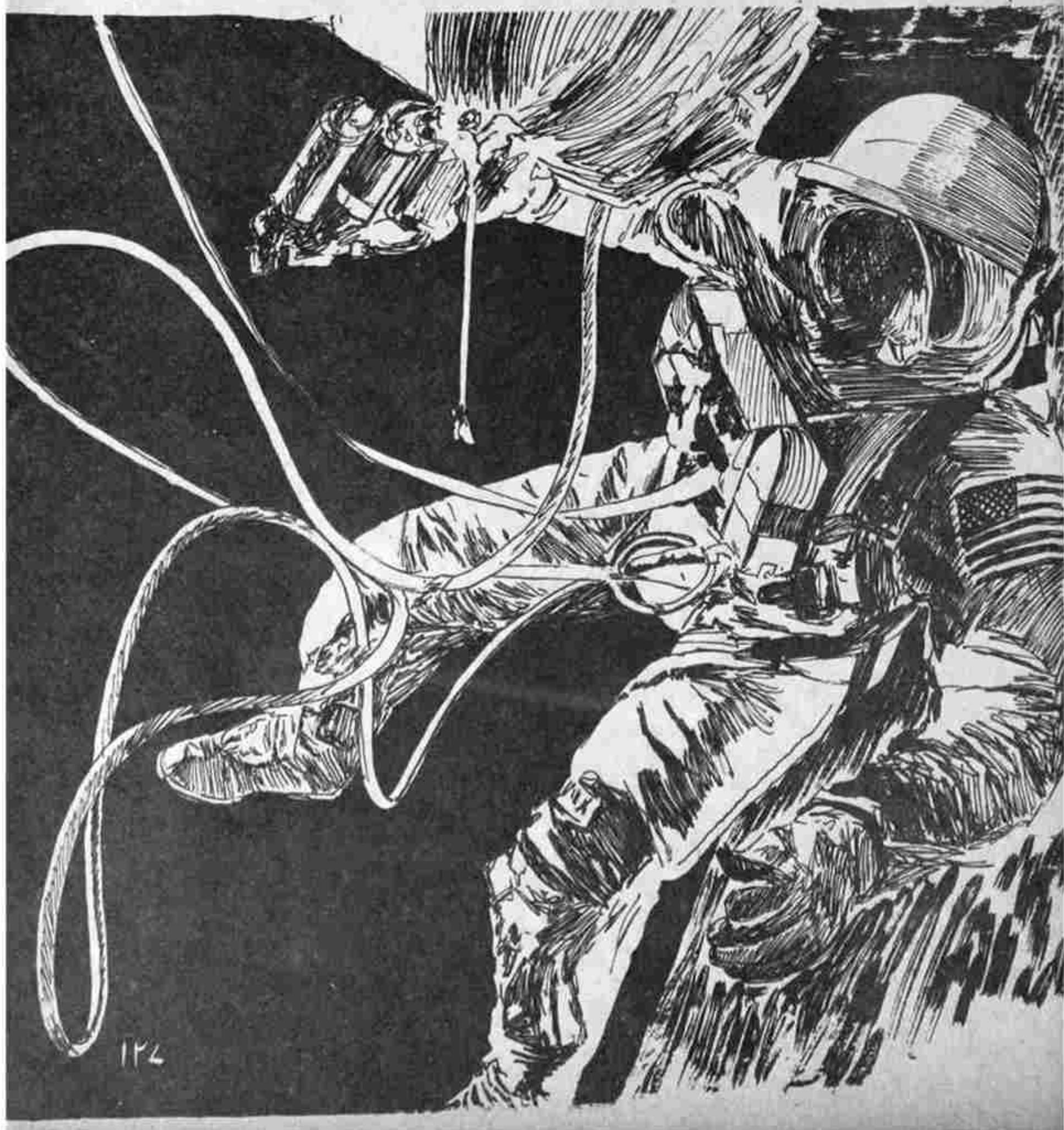
دانوں نے زمین کی کشش میں دوبارہ داخل ہونے (Re - entry) کا مسئلہ بھی حل کر لیا اور اب وہ انسان کو خلا میں بھیجنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ جلد ہی وہ اس میں کام یاب بھی ہو گئے۔ ۱۲۔ اپریل ۱۹۶۱ کو روس نے یوری گیگارن کو خلا میں بھیج کر اپنی خلائی فتح کے جھنڈے گاڑ دئے۔ گیگارن نے ۱۰۸ منٹ تک خلا میں پرواز کی اور زمین کے گرد ایک چکّر لگانے کے بعد زمین پر واپس آگیا۔ پوری دنیا میں یوری گیگارن کا نام گونج اٹھا اور روسی سائنس دانوں کو اس عظیم کام یابی پر لاتعداد مبارک بادیں موصول ہوئیں۔ اور پھر ۶۔ اگست ۱۹۶۱ کو گیرمان تیتوف کی خلائی پرواز نے روس کی خلائی برتری پر اور مہر لگا دی۔ تیتوف کی پرواز گیگارن کی پرواز کے مقابلے میں زیادہ دیرپا اور کام یاب ثابت ہوئی۔ یعنی تیتوف نے ۲۵ گھنٹے ۱۸ منٹ خلا میں گزارے اور زمین کے گرد ۱۷ چکّر پورے کئے۔

اب تک روس کے تمام کام یاب تجربے تو منظرِ عام پر آئے تھے اور ناکامیوں پر دبیز پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ روس اپنے تجربے کا اُسی وقت اعلان کرتا تھا جب وہ اس میں کام یاب ہو جاتا تھا۔ گیگارن اور تیتوف کی پرواز کا پہلے سے کوئی اعلان نہ تھا، بلکہ اعلان اس وقت کیا گیا جب وہ دونوں خلا میں گردش کر رہے تھے۔ غالباً امریکہ کو شدید ذہنی جھٹکا دینے کے لئے روس ایسا کرتا تھا، کیوں کہ امریکہ نے اب تک انسان کو خلا میں بھیجنے میں کام یابی حاصل نہیں کی تھی۔ امریکہ کی مُسلسل ناکامیوں اور روس کی ایک کے بعد دوسری کام یابیوں نے لوگوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ امریکہ اب روس کے برابر نہ پہنچ سکے گا، مگر آخر مسلسل جد و جہد کے بعد ۲۰ فروری ۱۹۶۲ کو امریکہ نے اپنے خلاباز جون گلین کو خلا میں پہنچا کر ہی دَم لیا اور یہ ثابت کر دیا کہ روس نے جن تجربوں میں کام یابی حاصل کی ہے، جلد یا بدیر امریکہ بھی ان میں کام یاب ہو جائے گا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، دونوں ملک خلائی پرواز کے میدان میں ترقّی کرتے رہے۔ دونوں نے مشکلات پر قابو پا لیا ہے جو خلائی پرواز کے دَوران میں انسانی جسم پر اثر انداز ہوتی ہیں، مگر ابھی بہت سے ایسے مرحلے باقی ہیں جن پر قابو پانا ہے۔ روس اور امریکہ کے سائنس دانوں کے آہنی عزم اور مسلسل جد و جہد کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ وہ ہر اُس مشکل پر قابو پا لیں گے جو اُن کی راہ میں آئے گی۔ امریکہ نے اب تک ۲۴ اور روس نے ۱۱ خلابازوں کو خلا میں بھیجا ہے، جن کی تفصیل یہ ہے۔

خلاباز کا نام	اڑان کی تاریخ	خلائی جہاز کا نام	خلائی جہاز کی فی گھنٹہ رفتار (میلوں میں)	خلا میں کتنے چکر لگائے	ایک چکر لگانے میں کتنا وقت لگا (منٹوں میں)	خلاباز نے کل کتنا سفر کیا (میلوں میں)	خلاباز نے کل کتنے گھنٹے خلا میں پرواز کی
یوری گیگارن (روس)	۱۲۔ اپریل ۱۹۶۱	ووستوک نمبر ۱	۱۷۴۰۰	۱	۱۰۸	۳۱۳۲۰	ایک گھنٹہ ۴۸ منٹ
گیرمان تیتوف (روس)	۶۔ اگست ۱۹۶۱	ووستوک نمبر ۲	۱۷۷۵۰	۱۷	۸۸٫۳	۴۴۹۶۰۰	۲۵ گھنٹے ۱۸ منٹ
جون گلین (امریکہ)	۲۰ فروری ۱۹۶۲	فرینڈشپ نمبر ۷	۱۷۵۴۵	۳	۸۸٫۲	۸۷۷۲۵	۴ گھنٹے ۵۶ منٹ
اسکاٹ کارپینٹر (امریکہ)	۲۴ مئی ۱۹۶۲	ارورا نمبر ۷	۱۷۵۶۴	۳	۸۸٫۸	۷۹۰۳۸	۴ گھنٹے ۵۰ منٹ
اندریان نکولائیف (روس)	۱۱۔ اگست ۱۹۶۲	ووستوک نمبر ۳	۱۷۵۴۰	۶۴	۸۸٫۲	۱۶۱۲۰۰۰	۹۴ گھنٹے ۲۵ منٹ
پاویل پوپووچ (روس)	۱۲۔ اگست ۱۹۶۲	ووستوک نمبر ۴	۱۷۵۶۴	۴۸	۸۸٫۳	۱۲۴۰۰۰۰	۷۰ گھنٹے
والٹر شیرا (امریکہ)	۳۔ اکتوبر ۱۹۶۲	سِگما نمبر ۷	۱۷۵۶۰	۶	۸۸٫۹	۱۶۰۰۰۰	۹ گھنٹے ۱۵ منٹ
گورڈن کوپر (امریکہ)	۱۵ مئی ۱۹۶۳	فیتھ نمبر ۷	۱۷۵۴۶	۲۲	۸۸	۶۰۰۰۰۰	۳۴ گھنٹے
والیری بیکووسکی (روس)	۱۴ جون ۱۹۶۳	ووستوک نمبر ۵	۱۸۰۰۰	۸۱	۸۸٫۳	۲۱۲۴۰۰۰	۱۱۸ گھنٹے

خلاباز کا نام	اڑان کی تاریخ	خلائی جہاز کا نام	خلائی جہاز کی فی گھنٹہ رفتار (میلوں میں)	خلا میں کتنے چکر لگائے	ایک چکر کرنے میں کتنا وقت لگا (منٹوں میں)	خلاباز نے کل کتنا سفر کیا (میلوں میں)	خلا میں خلاباز نے کتنے گھنٹے پرواز کی
ویلنٹینا تیرشکووا (روس)	۱۶ جون ۱۹۶۳	ووستوک نمبر ۶	۱۸۰۰۰	۴۸	۸۸٫۴	۱۲۴۰۰۰۰	۷۲ گھنٹے
کمانڈر ولادیمیر کومارووف (روس)	۱۲۔۱۰ اکتوبر ۱۹۶۴	ووسخود	۱۸۱۲۵	۱۶	۹۰٫۱	۴۳۵۰۰۰	۲۴ گھنٹے
ڈاکٹر بورس ایگوروف (روس)	۱۲۔۱۰ اکتوبر ۱۹۶۴	ووسخود	۱۸۱۲۵	۱۶	۹۰٫۱	۴۳۵۰۰۰	۲۴ گھنٹے
کونستینتین فیوکتستوف (روس)	۱۲۔۱۰ اکتوبر ۱۹۶۴	ووسخود	۱۸۱۲۵	۱۶	۹۰٫۱	۴۳۵۰۰۰	۲۴ گھنٹے
پاویل بیلی ئوف (روس)	۱۸ مارچ ۱۹۶۵	ووسخود نمبر ۲	۱۸۰۰۰	۱۷	۹۱	۴۴۷۰۰۰	۲۶ گھنٹے
الیگزی لیونوف (روس)	۱۸ مارچ ۱۹۶۵	ووسخود نمبر ۲	۱۸۰۰۰	۱۷	۹۱	۴۴۷۰۰۰	۲۶ گھنٹے
ورجل گرسم (امریکہ)	۲۳ مارچ ۱۹۶۵	جیمنی نمبر ۳	۱۷۵۰۰	۳	۸۸	۸۷۵۰۰	۵ گھنٹے
جون ینگ (امریکہ)	۲۳ مارچ ۱۹۶۵	جیمنی نمبر ۳	۱۷۵۰۰	۳	۸۸	۸۷۵۰۰	۵ گھنٹے
جیمز میکڈوٹ (امریکہ)	۳ جون ۱۹۶۵	جیمنی نمبر ۴	۱۷۵۶۷	۶۲	۸۸٫۵	۱۷۲۰۰۰۰	۹۷ گھنٹے ۵۶ منٹ
ایڈورڈ وہائٹ (امریکہ)	۳ جون ۱۹۶۵	جیمنی نمبر ۴	۱۷۵۶۷	۶۲	۸۸٫۵	۱۷۲۰۰۰۰	۹۷ گھنٹے ۵۶ منٹ
گورڈن کوپر (امریکہ)	۲۱ اگست ۱۹۶۵	جیمنی نمبر ۵	۱۷۰۰۰	۱۲۰	۸۸٫۳	۳۳۴۶۰۰۰	۱۹۰ گھنٹے ۵۶ منٹ
چارلس کانراڈ (امریکہ)	۲۱ اگست ۱۹۶۵	جیمنی نمبر ۵	۱۷۰۰۰	۱۲۰	۸۸٫۳	۳۳۴۶۰۰۰	۱۹۰ گھنٹے ۵۶ منٹ
فرینک بورمن (امریکہ)	۴ دسمبر ۱۹۶۵	جیمنی نمبر ۷	۱۷۵۰۰	۲۰۶	۸۸٫۱	۵۷۸۳۷۵۰	۳۳۰ گھنٹے ۳۵ منٹ
جیمز لوویل (امریکہ)	۴ دسمبر ۱۹۶۵	جیمنی نمبر ۷	۱۷۵۰۰	۲۰۶	۸۸٫۱	۵۷۸۳۷۵۰	۳۳۰ گھنٹے ۳۵ منٹ
والٹر شیرا (امریکہ)	۱۵ دسمبر ۱۹۶۵	جیمنی نمبر ۶	۱۷۵۰۰	۱۶	۸۸٫۲	۴۵۴۵۰۰	۲۵ گھنٹے ۵۲ منٹ
تھامس اسٹیفرڈ (امریکہ)	۱۵ دسمبر ۱۹۶۵	جیمنی نمبر ۶	۱۷۵۰۰	۱۶	۸۸٫۲	۴۵۴۵۰۰	۲۵ گھنٹے ۵۲ منٹ
ڈیوڈ اسکاٹ (امریکہ)	۱۶ مارچ ۱۹۶۶	جیمنی نمبر ۸	۱۷۵۰۰	۷½	۸۸	۱۸۵۰۰۰	۱۰ گھنٹے ۴۲ منٹ
نیل آرمسٹرانگ (امریکہ)	۱۶ مارچ ۱۹۶۶	جیمنی نمبر ۸	۱۷۵۰۰	۷½	۸۸	۱۸۵۰۰۰	۱۰ گھنٹے ۴۲ منٹ
تھامس اسٹیفرڈ (امریکہ)	۳ جون ۱۹۶۶	جیمنی نمبر ۹	۱۷۵۰۰	۴۸	۸۸	۱۲۶۵۸۰۰	۷۲ گھنٹے ۲۲ منٹ
یوجین سرنن (امریکہ)	۳ جون ۱۹۶۶	جیمنی نمبر ۹	۱۷۵۰۰	۴۸	۸۸	۱۲۶۵۸۰۰	۷۲ گھنٹے ۲۲ منٹ
جون ینگ (امریکہ)	۱۸ جولائی ۱۹۶۶	جیمنی نمبر ۱۰	۱۷۵۰۰	۴۶	۸۸٫۱	۱۲۴۰۰۰۰	۷۰ گھنٹے ۴۷ منٹ
میکلن کوتر (امریکہ)	۱۸ جولائی ۱۹۶۶	جیمنی نمبر ۱۰	۱۷۵۰۰	۴۶	۸۸٫۱	۱۲۴۰۰۰۰	۷۰ گھنٹے ۴۷ منٹ
چارلس کانراڈ (امریکہ)	۷ ستمبر ۱۹۶۶	جیمنی نمبر ۱۱	۱۷۵۰۰	۴۸	۸۸	۱۲۶۰۰۰۰	۷۲ گھنٹے
رچرڈ گورڈن (امریکہ)	۷ ستمبر ۱۹۶۶	جیمنی نمبر ۱۱	۱۷۵۰۰	۴۸	۸۸	۱۲۶۰۰۰۰	۷۲ گھنٹے
جیمز لوویل (امریکہ)	۱۱ نومبر ۱۹۶۶	جیمنی نمبر ۱۲	۱۷۵۰۰	۵۹	۸۸٫۲	۱۶۵۳۷۵۰	۹۴ گھنٹے ۳۰ منٹ
ایڈون آلڈرن (امریکہ)	۱۱ نومبر ۱۹۶۶	جیمنی نمبر ۱۲	۱۷۵۰۰	۵۹	۸۸٫۲	۱۶۵۳۷۵۰	۹۴ گھنٹے ۳۰ منٹ

اِن پروازوں میں کچھ خلائی جہازوں میں صرف ایک مسافر نے سفر کیا ہے اور زیادہ تر جُڑواں اُڑانیں (TWIN FLIGHTS) ہوئی ہیں، لیکن ۱۲-اکتوبر ۱۹۶۴ کی پرواز میں روس نے ایک خلائی جہاز میں تین مسافروں کو بھیجا تھا جن میں ایک پائیلٹ، ایک ڈاکٹر اور ایک سائنس داں تھا۔

خلائی پرواز کے دَوران میں شروع شروع میں تو روس کا پلّہ ہی بھاری رہا۔ اُس نے جُڑواں اُڑان میں پہل کی، ایک خاتون کو خلا میں پہنچادیا اور سب سے بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ ووسخود نمبر ۲ کے خلاباز الیگزی لیونوف نے اپنے خلائی جہاز سے باہر نکل کر تقریباً پندرہ منٹ تک خلا میں تیراکی کی۔ اِس دَوران میں وہ ایک مضبوط رسّی سے اپنے خلائی جہاز سے بندھا ہوا تھا۔ اور یہ مرحلہ کام یابی سے طے کر کے خلائی جہاز میں واپس آگیا۔ ووسخود ۲ کی پرواز کے بعد سے اب تک روس بالکل خاموش ہے۔ اس عرصے میں امریکہ نے اپنی خلائی اُڑانیں جاری رکھی ہیں اور روس کو خلائی میدان میں بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ امریکی خلابازوں نے روس کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ کر کچھ نئے ریکارڈ بھی قائم کئے ہیں۔ مثلاً فرینک بورمن اور جیمز لوویل نے جیمنی ۷ میں دو ہفتے گزار کر طویل ترین پرواز کا ریکارڈ قائم کیا۔ زمین سے چاند پر جانے اور وہاں سے زمین پر واپس آنے کے لئے تقریباً اتنا ہی عرصہ درکار ہوتا ہے۔ جیمنی ۱۱ کے خلابازوں نے خلا میں ۸۵۰٫۳ میل کی بلندی پر پرواز کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس سے پہلے کہ تمام روسی اور امریکی اُڑانیں دو سوسے چار سو میل کی بلندی تک ہوئی تھیں۔ ایڈورڈ وہائٹ نے ۲۱ منٹ تک یوجین سرنن نے دو گھنٹے ، منٹ تک اور کولنز نے ایک گھنٹہ ۱۵ منٹ تک خلائی جہاز کے باہر رہ کر الیگزی لیونوف پر برتری حاصل کی۔ کولنز دو بار اپنے خلائی جہاز سے باہر آیا اور ایک بار ۴۵ منٹ اور دوسری بار ۳۰ منٹ تک خلا میں تیرتا رہا۔ کولنز نے ایک کمال یہ اور کیا کہ اپنے خلائی جہاز جیمنی ۱۰ پر سے ایک دوسرے خلائی جہاز ایجنا (AGENA) پر گیا اور پھر جیمنی ۱۰ میں واپس آگیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خلا میں جہاز کے باہر رہ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا جاسکتا ہے۔ کولنز نے جہاز کے باہر رہ کر ستاروں کے بہت سے فوٹو بھی لئے۔ جیمنی ۱۲ کے خلاباز ایڈون آلڈرن نے تیراکی کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دئے۔ وہ تین بار اپنے خلائی جہاز سے باہر آیا اور اس طرح کُل ۵ گھنٹے ، ۲ منٹ خلائی جہاز کے باہر گزارے۔ اس نے اپنے جہاز کے اوپری حصے پر بیٹھ کر ستاروں اور کہکشاں کی تصویریں اُتاریں۔ تاریخ میں پہلی بار جیمنی ۱۲ کے خلابازوں نے ۱۲ نومبر ۱۹۶۶ کو زمین سے باہر رہ کر سورج گہن کی تصویریں لیں۔

ایک اور سب سے بڑا کارنامہ جو امریکی خلابازوں نے انجام دیا ہے۔ ایک خلائی جہاز کو دوسرے خلائی جہاز سے جوڑنے کا ہے۔ یہ عمل کئی بار کام یابی سے کیا جا چکا ہے۔ اس تجربے سے خلائی جہازوں کو خلائی اسٹیشنوں پر اُترنے میں مدد ملے گی۔

جیمنی ۱۲ کے ساتھ امریکہ کی جیمنی اُڑانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اب امریکہ کچھ دنوں میں اپالو (APPOLO) جہازوں کی پرواز شروع کرنے والا ہے۔ اپالو میں تین خلاباز سفر کریں گے۔

امریکہ نے اعلان کیا ہے کہ ۱۹۶۹ کے آخر تک انسان کو چاند پر پہنچا دے گا۔ امریکہ نے خلائی پرواز میں پے در پے جو شان دار اور نمایاں کام یابیاں حاصل کی ہیں، ان کے پیشِ نظر ایسا ہونا ممکن ضرور ہے مگر اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چاند کی سرزمین پر قدم رکھنے والا امریکی ہو گا یا روسی۔

■ ■

اجاگر وارثی

اُوٹ پٹانگ کو ہم نے دیکھا موج مناتے کرتے ٹھاٹ
یار بہت ہیں اُس کے لیکن گہرا یار ہے فضلو جاٹ
دونوں ہی ہیں چلتے پُرزے، ایک کریلا ایک ہے نیم
آنکھ بچی اسکول سے غائب، سیروں کی ہے ان کو چاٹ
ساٹھے کے باغیچے میں وہ اِک دن پہنچے چپکے سے
پُختہ اور سُنہری گچھے توڑ کے کھائیں گے لوکاٹ
ساٹھا مُنہ سے حُقہ لگائے گُڑگُڑ اور دھوئیں میں مست
دُبک گئے یہ دم سادھے کہ کب سوئے وہ لے کر کھاٹ
حُقّہ کو کونے میں دھر کر آخر ساٹھا لیٹ گیا
خراٹوں میں ڈوب گیا جب، پھر تھی ان کی راہ سپاٹ
اِن کو یہ معلوم نہیں تھا... تاڑ لیا تھا ساٹھے نے!
وہ بھی تو انجان نہیں تھا، پیا تھا پانی ہر ہر گھاٹ
توڑنے ہی والے تھے پھل کہ "دیو" نے اک دم گردن بھینچ
حکم دیا تو کان پکڑ، تو ناک سے چار لکیریں کاٹ۔

ڈاکٹر کیول دھیر

ینگ — تمہیں بھی بڑا آدمی بننا ھے

کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ بے حد سخت سیمنٹ کی سطح کو توڑ کر کبھی کبھی کوئی زم و نازک سا کومل سا پودا سینہ تانے نکل پڑتا ہے۔

جیمز ایک ایسا ہی پودا تھا۔

۷ جون ۱۸۱۱ کو جب جیمز ایک نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوا تو اس کی پیدائش پر کوئی خاص خوشی نہیں منائی گئی نہ کوئی جشن ہوا، نہ دھوم دھام۔ اس لئے کہ اُس کے والد ایک معمولی آدمی تھے۔ بکری کا کاروبار اُن کی گزر بسر کا ذریعہ تھا۔ معمولی سی آمدنی میں انہیں ایک بڑے خاندان کا خرچ چلانا پڑتا تھا۔ یہ خاندان جیمز کے علاوہ اس کے سات بڑے بھائیوں اور ماں باپ پر مشتمل تھا اور اسکاٹ لینڈ میں لِلِتھگو کے ایک گاؤں باتھ گیٹ میں رہتا تھا۔ یہ اسکاٹ لینڈ کا سب

سے کچھ بڑا ہوا علاقہ تھا۔

جیمز کی زندگی نے ایسے ہی گھٹے گھٹے ماحول میں پنپنا سیکھا تھا۔
جب وہ کچھ بڑا ہوا تو اسے گاؤں کے اسکول میں داخل کرادیا گیا وہ بہت
ذہین اور ہوشیار تھا، اور اتنا ہی جذباتی بھی تھا جتنی دل چسپی اسے
اپنی تعلیم میں تھی، اتنی ہی اپنے ماحول میں بھی تھی۔ اُس کی ذہانت کا یہ
عالم تھا کہ اس کے استاد اس پر فخر کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ چپ چاپ اور
سنجیدہ رہتا تھا۔ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے باپ کا ہاتھ
بٹاتا تھا اور بیکری کے کام میں ان کی مدد کرتا تھا۔ اسے اپنی غریبی اور
اپنے والد کے بڑھاپے کا بڑا احساس تھا۔ رات کو جب کام سے فارغ ہو کر وہ
بستر پر لیٹتا تو اکثر اپنے حالات، اپنے ماحول اور اپنے آپ کے بارے
میں سوچا کرتا اور ہر بار اُس کا یہ ارادہ مضبوط تر ہوتا جاتا کہ اس کی زندگی
کا ضرور کوئی خاص مقصد ہے، اسے ضرور کوئی بہت بڑا کام کرنا ہے،
اسے ضرور بہت بڑا آدمی بننا ہے۔

اُن دنوں جیمز کی عمر صرف چودہ برس تھی۔ اس کے والد غریب
ضرور تھے لیکن جیمز کی ذہانت اور تعلیم میں اس دل چسپی کے پیشِ نظر وہ
ہمت کر ہی بیٹھے اور اسے ایڈن برا یونی ورسٹی میں داخل کرانے کے لئے
تیار ہو گئے۔ اس طرح جیمز کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ پہلے اُس نے
آرٹس کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی، لیکن دو سال بعد اس نے میڈیکل
کو اپنی تعلیمی دل چسپیوں کا مرکز بنایا۔ اکیس برس کی عمر میں اس نے ڈاکٹر کی
ڈگری حاصل کرلی۔ ڈاکٹری کی ڈگری کے لئے اس کے تحقیقی مضمون کا موضوع
تھا "موت" اور "سوجن اور جلن"۔ اس مضمون کا چرچا دُور دُور تک ہوا۔
شعبۂ امراض کے پروفیسر ڈاکٹر جان ٹامسن اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں
نے جیمز کو اپنا اسسٹنٹ بنانے کی پیش کش کی، جسے اس نے بہ خوشی قبول
کرلیا۔ ڈاکٹر ٹامسن کی راہ نمائی میں اس نے خوب محنت، لگن اور دل چسپی
سے کام کیا اور عملی طور پر اپنے فن میں مہارت حاصل کی۔

۱۸۳۷ میں جب ڈاکٹر جان ٹامسن نے ایک سال کی رخصت
لی تو جیمز ان کی جگہ پروفیسر کے طور پر کالج میں طالب علموں کو پڑھانے لگا۔
اسی سال اُس نے مختلف بیماریوں کا گہرا مطالعہ کیا، جن میں سے قابلِ
ذکر موضوع زچہ کے امراض تھا۔ اگلے ہی برس اِس موضوع پر اس نے
ایک اہم لیکچر بھی دیا۔ ۱۸۹۳ میں اسی شعبے میں ایک پروفیسر کی جگہ خالی
ہوئی، جس کے لئے ایک بڑی شرط یہ تھی کہ امیدوار شادی شدہ ہو۔ جیمز
نے اس شرط کو پورا کرنے کے لئے ایک دُور کی رشتہ دار نوجوان خاتون
جیسی گرنڈلے سے شادی کرلی۔ گرنڈلے سے جیمز کی پہلے سے ہی دوستی
تھی اور اکثر وہ چھٹی کے دنوں میں اس کے یہاں لورپول جایا کرتا تھا۔
اس طرح وہ اس جگہ کے لیے چُن لیا گیا۔ اب اسے ایک خاص پوزیشن
حاصل ہو گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب فنِ جراحت (سرجری) میں آج کی طرح
نمایاں کامیابیاں حاصل نہیں کی گئی تھیں بلکہ آپریشن وغیرہ میں اس
بات کی کوئی پروا نہیں کی جاتی تھی کہ مریض کو کس قدر تکلیف کا سامنا
کرنا پڑتا ہے۔ ایک سرجن کو محض آپریشن کرنے سے ہی غرض ہوتی تھی،
چاہے مریض درد کی شدت سے مر ہی کیوں نہ جائے۔

جیمز بچپن ہی سے بے حد جذباتی تھا۔ کسی کو معمولی سی تکلیف
میں بھی دیکھتا تو اس کا دل رو دیتا اور وہ یوں محسوس کرتا جیسے درد سے
وہ خود کراہ رہا ہے۔ اب وہ خود ڈاکٹر بن چکا تھا، لیکن اس کے جذبات
میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اب بھی وہ ایک دردمند دل
اپنے سینے میں رکھتا تھا۔ چنانچہ جیمز نے جب فنِ جراحت کے اِن
طور طریقوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو ایڈنبرا یونی ورسٹی کے پروفیسر
اور طلبا حیران ہوئے، کیوں کہ اس زمانے میں یہی طور طریقے عام ہی
تھے۔ جیمز سائنس کی گہرائی میں ڈوب کر بھی انسانیت کے لئے راحت
کے خواب دیکھتا تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ مریض اور درد بھری زندگی
انسانیت کے ماتھے پر داغ ہیں۔ اس کی نظریں جب بھی آپریشن کی
میز پر پڑے ہوئے مریض تک پہنچ کر رک جاتیں تو اُس کے جذبات
درد سے بھرا اٹھتے۔

۱۸۴۶ کے ماہ دسمبر میں اُس نے سنا کہ مارٹن نامی ایک امریکی

دانتوں کے ڈاکٹر نے 'ایتھر' کے ذریعہ مریض کو بے ہوش کر کے بلا تکلیف دانت نکالنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ اِس سے پہلے ۱۸۰۰ء میں ہمفری ڈیوی نے یہ مشورہ دیا تھا کہ آپریشن کے وقت لافنگ گیس کا استعمال مریضوں پر کیا جانا چاہیئے۔ کیوں کہ اس سے زیادہ خون نہیں بہتا اور مریض کو زیادہ درد محسوس نہیں ہوتا۔ مشہور سرجن رابرٹ لسٹن نے پہلی بار آپریشن کے وقت مریض پر ایتھر کا استعمال کیا' جسے جیمز نے بھی دیکھا اور وہ بے حد متاثر ہوا' اُس نے دل ہی دل میں یہ ارادہ کرلیا کہ آئندہ وہ بھی اپنے مریضوں پر ایتھر کا استعمال کرے گا اور اپنے اِس ارادے میں وہ کامیاب بھی ہوا۔

لیکن اس کامیابی کے ساتھ ہی جیمز کو مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ دقیانوسی قسم کے ڈاکٹروں کے علاوہ اسکاٹ لینڈ کے مذہبی راہ نماؤں نے بھی احتجاج کیا کہ بچّے کی پیدائش کے وقت عورت کو بے ہوش کرنا بائبل کی بے حرمتی ہے۔ لیکن جیمز نے اس مخالفت کی کوئی پروا نہ کی بلکہ بائبل سے ہی اس بات کے حق میں مثالیں پیش کیں کہ یہ فعل بے حرمتی قطعی نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ اپنے آپ ہی اس کے مخالف لوگوں کی تعداد کم ہوتی گئی اور جیمز اپنی لگن میں اپنے مقصد کی طرف کامیابی سے آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔

جیمز نے محسوس کیا کہ ایتھر بے ہوش کرنے کے مقصد کے لئے کوئی اعلےٰ دوا نہیں ہے' کیوں کہ اس کے استعمال سے مریض کو کئی طرح نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا تھا وہ کسی ایسی نئی دوا کی کھوج میں مصروف ہوگیا تھا جس سے نقصان کا اندیشہ کم سے کم ہو۔ دن رات وہ تجربوں میں مصروف رہتا۔ سارے دن تجربہ گاہ میں مصروف رہنے کے بعد جب وہ گھر لوٹتا تو بھی آرام نہ کرتا اور رات کو بھی اپنے گھر کی تجربہ گاہ میں مصروف رہتا۔ تجربوں کے سلسلے میں وہ اپنے تین معاون ڈاکٹروں کو بھی گھر پر بلا لیتا۔

یہ سلسلہ کافی دن تک جاری رہا۔ آخر ایک رات اسے کامیابی حاصل ہو ہی گئی۔

گول میز پر ایک بوتل رکھی تھی اور اُس کے اِردگرد اس کے علاوہ تینوں معاون ڈاکٹر بیٹھے تھے۔ جیمز انہیں کافی دیر تک کچھ باتیں سمجھاتا رہا اور پھر باری باری وہ بوتل کھول کر انہیں سونگھا دی۔ جیمز نے دیکھا کہ لمحہ بھر میں ہی وہ تینوں بے ہوش ہو کر اپنی اپنی کرسی پر لڑھک گئے تھے۔

جیمز خوشی سے چلّا اٹھا — اُس کا تجربہ کامیاب ہوگیا تھا۔

طِب کے میدان میں جیمز کی کامیابی نے تہلکہ مچا دیا۔ یہ مبارک دن ۴ نومبر ۱۸۴۷ء کا تھا۔ اس دن دنیا میں پہلی بار ایک ایسی دوا ایجاد ہوئی جس کی مدد سے سرجری کی بے شمار رکاوٹیں دُور ہوگئیں۔ اور وہی دوا آج بھی دنیا کے ہر حصّے میں' ہر آپریشن کے وقت استعمال میں لائی جاتی ہے۔

یہ دوا تھی 'کلوروفارم' جسے سر جیمز ینگ سمپسن نے ایجاد کیا تھا۔ اس عظیم ترین کامیابی پر جیمز کو ساری دنیا میں شہرت اور عزّت ملی۔

۱۸۴۷ء میں ہی اسے ملکہ وکٹوریہ نے اسکاٹ لینڈ میں اپنا ذاتی معالج مقرر کرنے کا اعلان کر دیا۔ اسی وقت اسے پیرس کی طبّی اکاڈمی کا غیر ملکی ممبر بھی چُنا گیا، حالاں کہ جیمز کا چُنا جانا اکاڈمی کی شرطوں کے خلاف تھا۔ یورپ اور امریکہ کے لگ بھگ تمام طبّی و صحتی اداروں کا وہ ممبر بنایا گیا اور اُسے بہت سے اعزاز بھی عطا کئے گئے۔ ۱۸۶۶ء میں جیمز کو "برونیٹ" کا خطاب عطا کیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسکاٹ لینڈ کے کسی باشندے کو اتنا بڑا خطاب دیا گیا ہو۔

دنیا بھر کے بے شمار انسانوں کی زندگی کو محفوظ بنانے کے لیئے جیمز نے کلوروفارم کی ایجاد کر کے جو بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا وہ اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک کہ انسان کا وجود قائم ہے اگرچہ ۶ مئی ۱۸۷۰ء کو سر جیمز ینگ سمپسن کا انتقال ہوگیا لیکن اس کا نام اس دنیا سے کبھی مٹے گا نہیں' اس لیئے کہ بڑے کام ہی انسان کو بڑا بناتے ہیں' اور اُسے امر کر دیتے ہیں۔ ●●

سعید امرت

بڑی چیز

راجا، راجو دو نام تھے جو گلی میں نفیری کی طرح بجتے تھے۔ ان کا لڑنا جھگڑنا روز کی بات تھی۔ ایسے ہی جیسے مٹی کا کوئی برتن ٹوٹ جائے، کانچ کا گلاس گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

راجا غریب تھا، راجو امیر۔ راجا بے سہارا، یتیم، ایک غریب بہن کے سہارے جی رہا تھا۔ راجو امیر ماں باپ کا بیٹا تھا۔ بھرا پُرا گھرانہ، رہنے کے لئے محل سا گھر، خدمت کے لئے نوکر چاکر۔

لیکن سارے فرق دھرے رہ جاتے جب یہ دونوں ایک ساتھ گلی میں کھیلتے۔ کھیلتے کھیلتے جب جھگڑا ہوتا تو راجا راجو کے ایک دو ہاتھ رسید کر دیتا۔ کہتا۔

"جاؤ لاٹ صاحب، جاکر اپنے ماں باپ سے کہو کہ راجا نے مارا ہے۔ وہ آکر پھر میری مرمّت کریں گے تو حساب برابر ہوگا۔

راجو روتا دھوتا گھر جاتا، شکایت کرتا۔ ماں اسے سینے سے لگاتی، پیار کرتی اور راجا کی خبر لینے کو ایک نوکر کو اس کی بہن کے پاس بھیج دیتی۔ کہلا بھیجتی اگر آئندہ راجا نے راجو پر ہاتھ ڈالا تو ہڈّیاں توڑ دی جائیں گی۔

غریب بہن راجا کی شکایت سُنتی، نوکر کو اطمینان دلاتی، اور راجا کو بُلا کر اس کے کان اینٹھتی۔ کہتی،

"تیرا کیا جائے گا؟ کسی دن راجو کا باپ ہماری اس کال کوٹھری کو زمین سے اُکھڑوا پھینکے گا۔ پھر سر چھُپانے کے لئے کوئی جگہ بھی نہ ملے گی۔"

راجا سُنتا، مُسکراتا، کہتا،

"اگر وہ اس کال کوٹھری کو اکھاڑ پھینکے گا تو میں بھی اس کے گھر کے سارے دروازے، سارے شیشے توڑ کر برابر کر دوں گا۔"

اب بہن اسے کیسے سمجھاتی کہ ناسمجھ دُنیا ہے، امیر

غریب کا فرق اس پر آج بھی باقی ہے۔ تیرا راجو کا کوئی ساتھ نہیں،
تو نے قلم سیدھا کرنا نہیں سیکھا، اور اسے پڑھانے کو دو دو
ماسٹر گھر پر آتے ہیں۔ وہ خود گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر اسکول
پڑھنے کو جاتا ہے۔"

ہفتے کی رات کو گلی میں اِدھر اُدھر کے آٹھ دس لڑکے
ایک ہو گئے۔ ڈرامہ کرنے کا پروگرام بنا۔ ڈرامہ تھا بادشاہ اکبر کا،
اس میں ایک کو فریادی، ایک کو ظالم، ایک کو درباری اور ایک
کو اکبر بادشاہ بننا تھا۔ سب لڑکے سر جوڑ کر یہ سوچنے بیٹھے کہ
اکبر بادشاہ کون بنے؟

راجا سینہ تان کر آگے آیا، بولا "میں راجا ہوں، اکبر
بادشاہ میں بنوں گا۔

راجو بڑے زور سے ہنس کر کہنے لگا۔ تو کیا بنے گا؟
نہ لکھا اور بنے گا بادشاہ! بادشاہ وہ بنتا ہے جسے سب کچھ معلوم
ہو، جیسے یہ معلوم ہو کہ کوئی چور ہے تو اسے کیا سزا ملے گی۔
کوئی خراب ہے تو اسے کیسے اچھا بنایا جائے گا۔ بادشاہ کو سب
لوگوں کے دکھ اور غم معلوم ہوتے ہیں۔"

راجا چپ ہو گیا، پھر ذرا ضد کرتے ہوتے بولا "پڑھنے
لکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ دیکھ میں تم سب سے تگڑا ہوں، خوب
بھاگ سکتا ہوں، سب کو پچھاڑ سکتا ہوں، بادشاہ کو
مضبوط ہونا چاہئے۔ کیوں رے چھوٹو، ہاں بول نا؟"

چھوٹو کچھ نہ بولا اور دوسرے، موٹو، دلاور، شیرو،
کالو، چنو، منو بھی دم سادھے بیٹھے رہے، آخر سب نے راجو
کی بات پر ہاں کہہ دی، سب کی رائے یہی ٹھیری کہ بادشاہ کے
لئے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے، راجا بادشاہ نہیں بن سکتا،
بادشاہ راجو بنے گا۔ راجا چاہے تو چور بن سکتا ہے۔

اس فیصلے سے راجا کو آنکھیں چڑھ گئیں۔ پہلے تو سوچا
سب کو درخت سے توڑی ہوئی چھڑی لے کر مارے لیکن ایک
ساتھ سب کو مارنا آسان نہ تھا۔ اس نے ہار مان لی اور دھیمے
دھیمے قدموں سے دُور ہٹ گیا۔

چھوٹو اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ جا کر دیکھا تو اندھیرے
کونے میں بیٹھا راجا سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ واپس آکر
اس نے سب دوستوں کو یہ خبر دی۔ راجو نے کہا "روتا ہے
تو رونے دو۔ ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟ کیسے ایک جاہل
کو بادشاہ بنا دیں؟"

سب کے سب سہم کر رہ گئے تھے۔ راجا اور روئے
یہ بات ان کے ذہن میں کبھی نہ آئی تھی۔ آخر یہ طے ہوا کہ اس
وقت راجا کو نہ چھیڑا جائے، ڈرامے کے بعد سب اپنے اپنے
گھر کو جائیں، ہاں کل راجو کا گھوڑا گاڑی میں سیر کا اور باغ میں
جا کر مٹھائی، پھل کھانے کا جو پروگرام ہے، اس میں راجا کو
بھی ساتھ لے لیا جائے۔

اگلے دن صبح کو راجو کی گھوڑا گاڑی میں کھانے
پینے کی چیزیں رکھی جا رہی تھیں — کیلے، سنترے، انار، مٹھائیاں۔
راجو کے ماں باپ نے خوشی سے اسے اتوار کی چھٹی شہر سے
دُور کسی باغ میں منانے کی اجازت دی تھی اور ساتھ ہی اس
سے یہ بھی کہا تھا کہ اپنے دو چار دوستوں کو ساتھ لے جائے۔

راجو کوچوان کی جگہ پر چابک لئے بیٹھا تھا۔ دوسرے
لڑکے ابھی بیٹھے نہ تھے، اتنے میں سینہ نکالے راجا اپنے گھر
سے نکل کر گھوڑا گاڑی کی طرف آیا۔ راجو نے اسے دیکھا تو
تیزی سے بولا، "کیوں راجا، چلے گا سیر کرنے ہماری گاڑی میں؟"
"نہیں، تم ہی جاؤ۔ تمہارا میرا کیا ساتھ؟ تم پڑھے لکھے
میں جاہل! چلو اپنا راستہ لو۔"

راجو کو غصہ آ گیا۔ بے دھیانی میں ہنٹر گھوڑے کی
کمر پر جا کر بولا، "نہیں جاتا تو نہ جا۔ احسان کس پر جتاتا ہے؟"

گھوڑے کی کمر پر ہنٹر لگا تو گھوڑا بدک گیا، اور چمک کر بھاگا۔ کوچوان سامنے سے نہ ہٹ جاتا تو اس کا چورا ہونا ضروری تھا۔ گھوڑا گاڑی تیزی سے سڑک پر نکل آئی۔ راجو ڈر کے مارے چیخنے لگا۔ گھوڑا فرّاٹے بھرنے لگا۔ کون اسے روکتا، کون دوڑتا؟ ایک شور مچ گیا۔" لینا پکڑنا! بھاگنا، دوڑنا!"

کوچوان بوڑھا تھا۔ دم نہ درود۔ تکتا رہ گیا، لڑکے سب ڈر سے ایک طرف سمٹ کر کھڑے ہوگئے۔

پلک جھپکتے ہی راجا دوڑ پڑا۔ گاڑی آگے نکل گئی تھی، انسان اور گھوڑے کی دوڑ کا کیا مقابلہ؟ لیکن راجا نے ایسی دوڑ لگائی کہ ہرن بھی کیا لگائے گا۔ وہ گھوڑا گاڑی کے پیچھے دوڑتا چلا گیا۔ گھوڑا گاڑی سڑک پر نکلی چلی جارہی تھی، پیچھے پیچھے راجا بھاگا جارہا تھا۔ جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ بدکے ہوئے گھوڑے اور انسان کی دوڑ کا بھلا کیا مقابلہ؟

ایک جگہ دوڑتا ہوا گھوڑا ڈرا تو ذرا سہم کر رُکا۔ بس اسی وقت راجا نے ایک لمبی سی چھلانگ لگائی اور گاڑی پر چڑھ گیا۔ راجو کا ڈر کے مارے بُرا حال تھا۔ اگر راجا گاڑی پر نہ چڑھ جاتا تو وہ دم بھر میں نیچے گر پڑتا۔ راجا نے راجو کو سہارا دیا۔ بولا،" جلدی سے کوچوان کی جگہ سے اُتر کر پیچھے گدّی پر دُبک کر بیٹھ جاؤ۔ میں گھوڑے کو روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

راجا کی مدد سے راجو کوچوان کی جگہ سے اترا اور پیچھے گدّی پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ راجا کوچوان کی جگہ پر چڑھ کر گھوڑے کی باگیں ٹٹولنے لگا۔ باگیں گھوڑے کی ٹانگوں میں آکر کب کی ٹوٹ چکی تھیں۔ بس اب تو خالی اُمّید ہی اُمّید تھی۔

کرنا خدا کا، گھوڑا سڑک سے ہٹ کر پٹڑی پر چڑھ گیا۔ ایک پہیہ ضرب کھا کر ٹوٹا، دوسرا جھٹکے سے نکل گیا۔ ایک دھماکے سے گاڑی چلتے چلتے رُک گئی۔ راجا اس اچانک دھماکے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ گرتی ہوئی گاڑی پر بیٹھ کر نہ سنبھل سکا۔

اور اُچھل کر زمین پر آگرا۔ گاڑی اُلٹ گئی اور گھوڑا رُک گیا۔

گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے لوگ اتنی دیر میں وہاں آ پہنچے۔ دیکھا کہ گاڑی اُلٹی پڑی ہے، راجو گدّی پر سمٹا ہوا سہما بیٹھا ہے اور راجا پکّی زمین پر بے ہوش پڑا اس کے سر سے خون کا فوّارا جاری ہے۔

راجو کے ماں باپ نے راجو کو سلامت دیکھ کر بلائیں لیں اور جلدی سے راجا کو موٹر میں بٹھا کر اسپتال لے کر چلے۔

ڈاکٹر نے راجا کو دیکھا، بستر پر لٹایا، بتایا،"خون سر سے بہت نکل گیا ہے، ہوش میں نہیں ہے۔ انجکشن لگائے دیتا ہوں، ابھی ہوش میں آجائے تو اس سے ایسی باتیں کریں جس سے اس کا دل خوش ہو جائے۔"

انجکشن لگنے کے آدھے گھنٹے بعد راجا نے کروٹ لی، آنکھیں کھولیں، دیکھا کہ راجو کے ماں باپ سرہانے کھڑے ہیں۔ چُپکا لیٹا ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔

راجو کے باپ بولے،" راجا بیٹے، طبیعت کیسی ہے؟ بولو تم کو کیا چاہئے؟"

راجا چُپ تھا۔

راجو کی ماں بولی،" راجا بیٹے، بولو کیا لوگے میرے لعل۔"

راجا چپ رہا، شاید کچھ سوچ رہا تھا۔

" بولو نا بیٹے تم کو کیا چاہئے؟ راجو کے باپ نے پھر کہا۔

" کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی کہوگے تو لے کر آؤں گا۔"

بولو۔"

راجا نے مونہہ کھولا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا،

" بابوجی، مجھے کتابیں، قلم دوات دلوا دیجئے۔ میں بادشاہ بنوں گا ——— آپ کے راجو جیسا!"

اور بابوجی حیرانی سے راجو کی ماں کو تکتے رہ گئے۔

●●

کام جلدی ختم کرنے کا آسان طریقہ
کھلی فضا میں سینما دیکھنے کا آسان طریقہ
موٹر ڈرائیونگ اسکول
اب میں آپ کو یہ کیسے سمجھاؤں کہ موٹر سمیت اس درخت سے کیسے اترا جائے؟
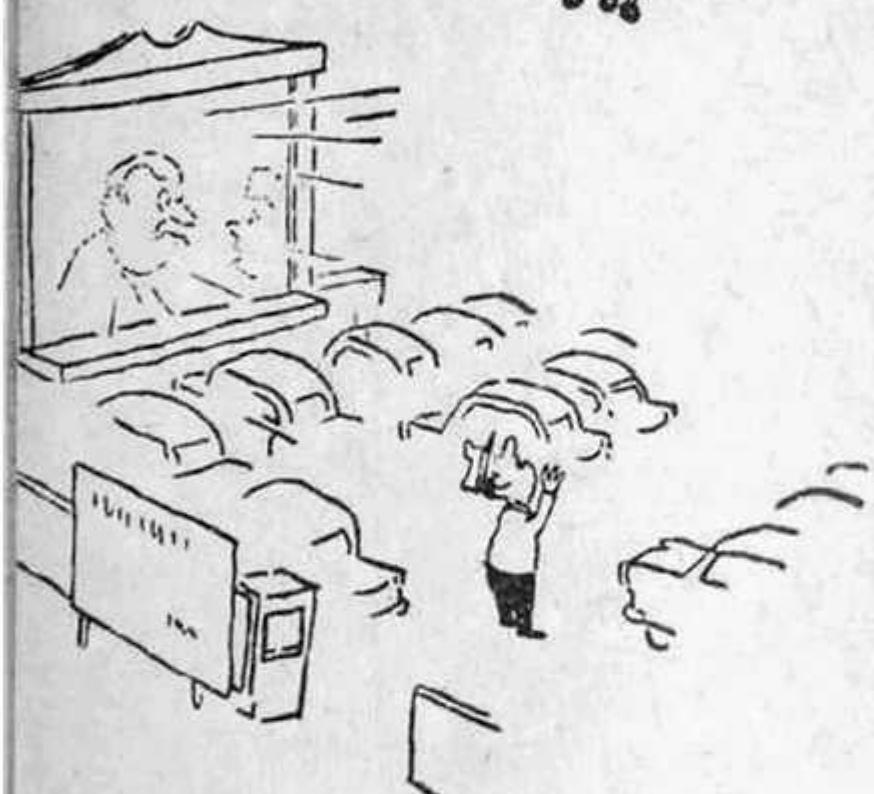
اُبھرتے سورج کی سرزمین

جاپان

اشتیاق بچھرائیونی

اگر کوئی تم سے کہے کہ چائے پینے کے ۳۱۳ آداب ہیں، اور یہ مذہبی تقریب جیسی رسم اگر صحیح طور پر ادا کی جائے تو پورے ڈھائی گھنٹے لگتے ہیں۔ تو شاید تم کہنے والے کو گپّی سمجھو گے، لیکن اُبھرتے سورج کی سرزمین، جاپان کی ریت یہی ہے۔

جاپان ہمارے ملک سے بہت دور شمال مشرق میں کچھ جزیروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ چھوٹا ہونے کے باوجود اس نے بڑی ترقی کی ہے۔ پچھلے سو سال سے ہم اس سے واقف ہوئے ہیں۔ کیوں کہ اس سے پہلے کسی بھی غیر ملکی کو ان کے یہاں آنے کی اجازت نہ تھی۔ اور نہ یہ لوگ خود کسی دوسرے ملک میں آجا سکتے تھے۔ ان کے یہاں جانے آنے کا سلسلہ دراصل ۱۸۵۳ سے ہوا ہے اس سے پہلے وہ باہر کی دنیا کو وحشی کہتے تھے۔

جاپانی بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ اگر تم ان کے یہاں ملنے جاؤ تو تمہاری خاطر تواضع چائے سے کریں گے ـــ اور وہ چائے اصل معنوں میں چائے ہی ہوگی، یعنی شکر اور دودھ بالکل ندارد۔ چائے کے یہ لوگ بڑے شوقین ہوتے ہیں پیلے پیلے سے رنگ کی چائے کو بڑے شوق سے پیتے ہیں۔

جاپان چین کے بہت قریب ہے۔ مگر ان کا کھانا چین کے کھانوں سے بڑا مختلف ہوتا ہے۔ ویسے یہاں چینیوں کے ریسٹوراں اور ہوٹل کثرت سے ملیں گے۔ مچھلی اور چاول ان کا من بھاتا کھاجا ہے۔ ہم لوگ چاول یا تو ہاتھ سے کھاتے ہیں یا چمچے سے مگر جاپانی چھوٹی چھوٹی تیلیوں سے چاول اس قدر جلدی اور احتیاط سے کھاتے ہیں کہ بس تم دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ چاول کا ایک دانہ بھی نیچے نہیں گرنے پاتا۔ میٹھے کیک بھی یہ لوگ بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اب سے سو سال پہلے تک یہ لوگ گوشت کو چھوتے تک نہ تھے۔ چوپایوں۔ جیسے بیل، گائے، بھینس اور بکری کے گوشت کو بڑا گندا سمجھتے تھے۔ وہ ہر طرح کا گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ بڑے شہروں میں تو اب مغربی طرز کے بڑے بڑے عالی شان ہوٹل ہیں۔ جہاں چھری کانٹوں سے انگریزی ڈھنگ سے کھانا کھایا جاتا ہے۔

یہاں زلزلے بہت آتے ہیں، اس لئے ان کے مکان ہمارے تمہارے مکانوں کی طرح نہیں ہوتے عام طور پر ان کے مکانوں کی باہری دیواریں لکڑی کی ہوتی ہیں۔ چھتیں کھپریل کی ہوتی ہیں یا ان کی جگہ چھپّر ڈال لیتے ہیں، اس چھوٹے سے مکان میں چھوٹے چھوٹے سے کمرے ہوتے ہیں۔ ان کمروں کی دیواریں کاغذ کی بناتے ہیں۔ یہ کاغذ کافی موٹا اور مضبوط ہوتا ہے۔ ان سے کمرے میں روشنی خوب رہتی ہے۔ پھر آپ ایک کمرے میں بیٹھے بیٹھے آسانی سے دوسرے کمروں میں بیٹھے ہوتے لوگوں کی گفتگو بھی سُن سکتے ہیں۔ کمروں کی کاغذی دیواروں پر جاپانی طرح طرح کی تصویریں بناتے ہیں۔ چڑیوں، جانوروں اور پھولوں کی تصویریں عام طور پر نظر آتی ہیں۔ ان میں وہ خوب صورت اور چمکیلے رنگ بھرتے ہیں۔ یہ کمرے خاصے آرام دہ ہوتے ہیں، مگر سردیوں میں بڑے تکلیف دہ ہوجاتے ہیں، کیوں کہ ان دنوں یہ بالکل برف کی طرح ٹھنڈے رہتے ہیں۔ مکانوں کو گرم رکھنے کے لئے جاپانی ایک خاص قسم کی انگیٹھی یا آتش دان کا استعمال کرتے ہیں۔ جاڑوں کے موسم میں تھوڑے سے کوئلے ہر وقت سُلگتے رہتے ہیں اس سے کمرہ گرم رہتا ہے۔ اور ٹھنڈ جاپانیوں کو زیادہ پریشان نہیں کرپاتی۔ بڑے بڑے شہروں میں اب گیس کی آگ کے استعمال سے مکان کو گرم رکھا جاتا ہے۔

جاپانی اپنے کمروں میں چٹائیاں بچھاتے ہیں۔ جاپانی زبان میں انہیں "ٹٹےمی" کہا جاتا ہے۔ یہ نازک اور ملائم ہونے کی وجہ سے بہت جلد ٹوٹ جاتی ہیں، اسی لئے جاپانی اپنے کمروں میں جوتے نہیں پہنتے۔ کمروں کے دروازوں پر پائے دان بچھے رہتے ہیں، جوتے وہیں اتار دئے جاتے ہیں، تاکہ چٹائیوں کو نقصان نہ پہنچ سکے۔ جاپانی گھروں میں میزیں کُرسیوں اور چارپائیاں نہیں نظر آتیں۔ یہ لوگ فرش پر بیٹھتے ہیں، یوں سونے کو یہ لوگ توشک اور گدّوں پر ہی سوتے ہیں، مگر ان کے گھروں میں توشک، گدّے اور لحاف نظر نہیں آئیں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف رات کو سوتے وقت یہ لوگ انہیں باہر نکالتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی انہیں تہہ کرکے الماریوں میں بند کردیتے ہیں۔ گھروں میں چھوٹی چھوٹی میزیں ضرور ملیں گی ـــ انہیں میز نہ کہہ کر چھوٹی چھوٹی چوکیاں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ کرسیوں کا استعمال نہیں کرتے، فرش پر ہی بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا میزیں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں۔ کہ فرش پر بیٹھ کر ہی وہ آسانی سے کام کرسکیں۔ مگر بڑے بڑے شہروں میں اب صوفہ سیٹ، کُرسیاں اور میزیں سب ہی ملتی ہیں، اگرچہ یہ نئے مکانات اتنے خوب صورت نہیں لگتے جتنے پُرانی طرز کے جاپانی مکان ہیں۔

ٹوکیو جاپان کی راج دھانی ہے۔ جاپان کا یہ سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ شہر بہت زیادہ گھنا آباد ہے ـــ اس کی آبادی نوّے لاکھ سے کچھ زیادہ ہی ہے ـــ یوں جاپان کی کُل آبادی چھ کروڑ سے کچھ زائد ہے، اسی شہر ٹوکیو میں شہنشاہ کا محل ہے۔ ہمارے ملک کی طرح یہاں جمہوری حکومت نہیں ہے۔ انگلینڈ کی طرح یہاں بھی جمہوری شہنشاہیت ہے، اس شہر میں مغربی ڈھنگ کی اونچی اونچی کوٹھیاں ہیں، نئے ڈھنگ کے عالی شان دفتروں کی عمارتیں ہیں۔ یہاں سڑکوں پر دوڑتی ہوئی کاریں ہی کاریں نظر آئیں گی۔ زیادہ تر لوگ مغربی ڈھنگ کا لباس پہنے نظر آئیں گے ـــ مگر قصبوں اور دیہاتوں میں اب بھی جاپان کی پُرانی زندگی ہی ملے گی۔

جاپان ایشیا میں تو خیر بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے ہی، دنیا کے بھی اہم ترین ترقی یافتہ ملکوں میں اسے گِنا جاتا ہے۔ اس کی ترقی کا راز یہ ہے کہ یہاں پڑھنے لکھنے کا بڑا زور شور ہے۔ سرکار کی طرف سے 9 سال تک تعلیم حاصل

کرنا لازمی تو ہے ہی، مفت بھی ہے۔

کسی ملک کے لوگ کس قدر تعلیم یافتہ ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ وہاں کے کتنے لوگ اخبار اور رسالے پڑھتے ہیں۔ اس ذرا سے ملک میں تقریباً سو سے زائد روزنامے نکلتے ہیں جو زیادہ تر دن میں دو بار چھپتے ہیں — تمام اخبار ملا کر تقریباً چار کروڑ روزانہ چھپتے ہیں۔ اخباروں کی تعداد میں امریکہ کے بعد جاپان کا نمبر ہی ہے۔ روس جیسے بڑے ملک میں جتنے اخبار روزانہ چھپتے ہیں تقریباً اتنی ہی تعداد جاپان جیسے چھوٹے سے ملک کی ہے۔ تیسرا نمبر انگلینڈ کا ہے۔ اسی طرح رسالے بھی یہاں بہت نکلتے ہیں، اِن کی تعداد تقریباً چھ ہزار ہے۔ ریڈیو سیٹ جاپان میں کثرت سے ہیں۔ ٹیلی وژن ان کے یہاں ۱۹۵۳ میں شروع ہوا، مگر اتنے کم عرصے میں ہی یہاں ۲۰۷ سے کچھ زیادہ ٹیلی وژن اسٹیشن بن گئے ہیں۔ امریکہ کے بعد جاپانی دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں ٹیلی وژن پر رنگین پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ ایسے رنگین پروگرام پیش کرنے والے ۵۰ اسٹیشن یہاں موجود ہیں۔

جاپانی مذہب کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ مذہب کی یہاں پوری پوری آزادی ہے۔ تقریباً ۵½ کروڑ لوگ بدھ مذہب کو مانتے ہیں۔ چھ سات لاکھ عیسائی ہیں۔ "شنتو پوجا" کا عقیدہ زیادہ تر لوگ مانتے ہیں۔ یہ کوئی مذہب نہیں ہے۔ اس عقیدے کے مطابق شاہی خاندان اور بزرگوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ عام طور پر اس عقیدے کو عیسائی اور بدھ مذہب کے ماننے والے سب ہی لوگ مانتے ہیں۔

جاپانیوں نے فلم بنانے کے میدان میں بھی بڑی ترقی کی ہے۔ اس میدان میں امریکہ (ہالی وُڈ) کے بعد جاپان کا دُنیا میں دوسرا نمبر ہے۔ ان کی فلمیں بڑی خوب صورت ہوتی ہیں۔ بین الاقوامی میلوں میں انہیں خوب انعام ملتے ہیں

برما کے سمندروں میں بانسوں کے بنے ایک تختے پر سونے کا ایک پگوڈا مندر ۶۲ سال تک بہتا رہا اور اس میں جلتا چراغ کبھی نہیں بجھا کیوں کہ ماہی گیر اس میں تیل ڈالتے رہے

فلم بنانا یہاں پچھلے پچاس برس سے شروع ہوا ہے۔ یہ لوگ فلم دیکھنے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔

جاپانیوں کی زبان چینی زبان سے بہت مختلف ہے ۱۰۰۰ سال سے ان کی زبان میں چینی الفاظ آنے شروع ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنے نئے حروف نہیں بنائے۔ لکھنے کا انداز انہوں نے چینی رسم الخط سے ہی لیا ہے۔ بلکہ اسے انہوں نے اور بھی زیادہ مشکل بنا دیا ہے اسی لئے ان کے لکھنے کے انداز کو ہم دنیا کا مشکل ترین لکھنے کا انداز کہہ سکتے ہیں۔

جاپانی کھیلنے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ ان کے اپنے کھیلوں میں "سمو" جودو اور کیسترو" ہیں۔ اب بھی یہ کھیل بڑے شوق سے کھیلے جاتے ہیں۔ اب تو یہاں مغربی کھیلوں کا چلن بھی ہو گیا ہے، فٹ بال، ہاکی، کرکٹ، ٹیبل ٹینس، اور دوسرے کھیلوں میں یہ لوگ کافی آگے نظر آتے ہیں۔

اس چھوٹے سے ملک کی اس حد تک ترقی کی وجہ جاپانیوں کی بے پناہ محنت اور لگن ہے۔ حقیقت میں ایشیا کے دوسرے ملکوں اور خود ہمارے ملک کو اس سے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اُسی وقت دنیا کی اس ترقی کی دوڑ میں ہم آگے بڑھنے کے قابل ہو سکیں گے۔

●●

ایک طالب علم کی ڈائری

غلام احمد فرقت کاکوروی

مجھے کل "کھلونا" کے دفتر کے سامنے سڑک پر ایک ڈائری پڑی ملی، جو کسی طالب علم کی ڈائری معلوم ہوتی ہے۔ اس ڈائری کے کچھ حصے کھلونا پڑھنے والوں کی تفریح کے لئے حاضر کئے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ ہوں :

۵ نومبر ۱۹۶۶

نہ جانے یہ بید بازی، جسے انگریزی میں کیننگ کہتے ہیں، کس منحوس اور بدبخت نے ایجاد کی ہے کہ ختم ہی ہونے میں نہیں آتی۔ ایک ماسٹر صاحب فرماتے تھے کہ شیطان نے جو سارے فرشتوں کا ہیڈ معلّم تھا، جب آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو پہلے عالم بالا میں اس کی کیننگ ہوئی اور کیننگ سے فارغ ہونے کے بعد اُسے فرشتوں کی صف سے نکال دیا گیا، اور جب وہ جھلّایا ہوا اس دنیا میں آیا تو اس نے بنی نوع انسان میں اپنی بَلا طالب علموں کے سر اُتار دی۔ چنانچہ اُس وقت سے یہ روایت چلی آ رہی ہے، حالانکہ اصولاً طالب علموں کی بجائے اُستادوں کی پٹائی ہونی چاہئے تھی۔ مگر ہمارے ملک کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے، یہاں اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے اور طلبار کی پٹائی ہو رہی ہے اور اس طرح طویلے کی بَلا بندر کے سر آ پڑی ہے اور دھوبی سے نہ جیتنے کی صورت میں گدھے کے کان اینٹھے جا رہے ہیں۔ سبحان اللہ کیا انصاف ہے!

آج سنیچر ہے۔ سنیچر کا دن ہمیشہ سے میرے لئے منحوس رہا ہے۔ چنانچہ پچھلی رات میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے اچانک وزیر بن کر میں بے حد دولت مند بن گیا ہوں اور دوسرے انتخاب میں میں پھر کھڑا ہوا ہوں۔ اور اس مرتبہ پھر میرے وزیر ہو جانے کا امکان ہے۔ مگر الکشن کا نتیجہ آنے پر میری ضمانت ضبط ہو گئی ہے۔ بستر پر ابھی میں نے پورے طور پر آنکھیں بھی نہیں کھولی تھیں کہ والدہ نے تین چار دھموکے رسید کئے اور کہا، نہ جانے قدرت نے کہاں کا آخور میرے سر تھوپ دیا۔ غضب خدا کا دس برس کا

ہوگیا مگر اس جوان جہان کو بستر گیلا کرتے شرم نہیں آئی۔

اس کے بعد جب اسکول جارہا تھا تو سڑک پر ایک یونورسٹی کالڑکا سائیکل پر سے میرے ایک بھرپور جھانپڑ مارتا اور کہتا گزر گیا "تفریح یا سیر بندوق یا فیر"۔

٦ نومبر ١٩٦٦

آج تمام دن یہ محسوس ہوا جیسے پیٹنے والوں کی ہڑتال ہے۔ ایسا خوش قسمت اور مبارک دن تو اس سال پہلی بار گزرا ہے۔ سویرے اٹھتے ہی والد صاحب کے ایک دوست، جو کہیں جج ہیں مہمان آگئے اور ان کے لئے والد صاحب نے توس، مکھن، پھل اور خالص گھی کی بہترین مٹھائی منگوائی اور دستر خوان پر مجھے بھی بٹھالیا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار یہ مبارک موقع نصیب ہوا تھا۔ مہمان صاحب بڑے نیک اور شریف تھے۔ انہوں نے ایک کیلے کے علاوہ کوئی چیز زبان پر نہ رکھی اور والد صاحب سے اپنے شہر کی رشوت ستانیوں کے ایسے قصّے بیان کرنا شروع کئے کہ والد صاحب ان کی باتوں میں گُم ہوگئے۔ موقع سے فائدہ اٹھاکر میں نے خوب ڈٹ کر ہر قاب کی مٹّی خراب کی۔ اس کے بعد جب اسکول گیا تو معلوم ہوا کہ آٹھ گھنٹوں میں چھ گھنٹے خالی ہیں، کیوں کہ آٹھ ماسٹر صاحبان چھٹی پر ہیں، جن میں تین ماشاءاللہ سخت بخار میں مبتلا ہیں۔ جزاک اللہ۔ اور اُمید ہے کہ کئی روز تک چھٹی پر رہیں گے۔ ایسے مبارک دن بھی سال میں بہت کم آتے ہیں۔ اِن ماسٹر صاحبان میں ایک ایسے صاحب بھی چھٹی پر ہیں جو کبھی بیمار ہونے کا نام نہیں لیتے۔

٧ نومبر ١٩٦٦

خدا غارت کرے ٧ نومبر کو۔ آج گئو ہتھیا کے سلسلہ میں سادھوؤں کا جلوس نکلنے والا تھا، اس لئے جیسے ہی اسکول پہنچا اسکول میں چھٹی ہوگئی۔ میں نے دُعا کی کہ خدا کرے روزانہ ایسے ہی جلوس نکلا کریں۔ مگر میری یہ دُعا شاید اللہ میاں کو بُری لگی۔ میں اسکول سے نکل کر آصف علی روڈ پر کھڑا ہوگیا جدھر سے کسی اسکول کے لڑکوں کا ایک بہت بڑا جلوس آرہا تھا۔ طرح طرح کی گالیاں بک رہے تھے اور آصف علی روڈ پر جو بڑی بڑی دُکانیں اور بینک ہیں اور جن پر بڑے بڑے شیشے کے کیس لگے ہوئے تھے اُن پر پتھر، ڈھیلے اور ڈنڈے مار مار کر اور ان کو توڑ توڑ کر ان شیشوں سے کہہ رہا تھا، "گئو ہتھیا بند کرو! جب چھن چھناتے ہوئے شیشے ٹوٹتے تھے تو مجھے بھی بڑا مزہ آتا تھا۔ سب تالیاں بجا رہے تھے۔ میں گھنٹہ بھر تک یہ تماشہ دیکھ کر جب گھر پہنچا تو قدم رکھتے ہی والد صاحب نے اندھا دُھند مارنا شروع کردیا۔ میرے گھر پہنچنے سے پہلے میرے ایک ساتھی نے والد صاحب سے کہہ دیا کہ میں بھی توڑ پھوڑ میں شریک تھا، حالاں کہ میں نہ خان تھا اور نہ خان کے اونٹوں میں۔ میری حیثیت صرف ایک تماشائی کی سی تھی۔ مگر جس کی قسمت میں جتنی مار لکھی ہوتی ہے وہ کھاکر رہتا ہے۔

٨ نومبر ١٩٦٦

آج ماسٹر صاحب کا دِل ہی جانتا ہوگا۔ میرے ایک ساتھی نے انہیں وہ چوٹ دی ہے کہ تین پشتیں یاد کریں گی۔ سال بھر سے خوب مُفت کے پان کھا کھا کر لالوں لال ہو رہے تھے، بلاناغہ دن میں دو مرتبہ پان منگواتے تھے اور ہمیشہ جیب میں ہاتھ ڈال کر کہتے تھے کہ اچھا اِس وقت اپنے پاس سے لے آؤ۔ کل پیسے لے لینا۔ ایک زمانہ سے ان کے مونہہ کو یہ خون لگا ہوا تھا۔ آج میرے ساتھی نے اُنہیں وہ چوٹ دی ہے کہ ان کا دل ہی جانتا ہوگا۔ میرے ساتھی کا باپ درزی ہے۔ نہ جانے ماسٹر صاحب نے یہ راز کیسے معلوم کرلیا تھا، چنانچہ دو تین مہینے سے کلاس میں اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا کہ تین قمیصیں اپنے باپ سے سِلوادو، جو سِلائی ہوگی دے دوں گا۔

ایک دن میرے ساتھی نے بھی جل کر کہہ دیا کہ آپ کپڑا دے دیں، دوسرے روز سِلی سِلائی قمیصیں مِل جائیں گی۔ چنانچہ یہ حضرت قمیصوں کے لئے ٹیری لین کپڑا لے آئے اور میرے ساتھی کو کپڑا دے کر کہا کہ قمیصیں پرسوں تک سِل جائیں۔ اس نے کپڑا رکھ لیا۔ آج اسے قمیصیں دینا تھیں۔ آج صبح کو وہ بھوں بھوں روتا پرنسپل صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا اور پرنسپل صاحب جب رونے کا سبب دریافت کرنے نکلے تو وہ پرنسپل صاحب کے قدموں پر گر کر کہنے لگا، "مجھے ماسٹر صاحب کی مار سے بچایئے! انہوں نے تین قمیصوں کا کپڑا دیا تھا جسے، نومبر کے ہنگامے میں لوگ اٹھا لے گئے اور دوکان میں آگ لگادی۔" اس نے ایسا بِلبِلا کر رونا شروع کیا کہ تمام اسکول کے استاد اور طلبار جمع ہو گئے۔ سب ماسٹروں نے اس سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا، "کوئی بات نہیں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ ماسٹر صاحب کی تم اولاد ہو۔ وہ تم سے ڈنڈ نہیں لیں گے۔" چنانچہ خود ان ماسٹر صاحب نے پورے اسکول کے سامنے اعلان کیا کہ وہ ہرگز اس سے کپڑے کا مطالبہ نہ کریں گے۔

۱۰ نومبر ۱۹۶۶

آج کا دن بڑا مبارک دن ہے۔ ہمارے ایک ماسٹر صاحب ہیں، جو مجھ سے روز تین سگرٹیں مفت منگوالیا کرتے تھے۔ ان کی چاندنی چوک میں جیب کٹ گئی اور سو روپے نکل گئے۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ چلو یک مشت تین چار سال کے سگرٹوں کے دام گرہ کٹ کو وصول ہو گئے۔ اے بے زبانوں کے یارِ غم گسار گرہ کٹ، سلام ہو تجھ پر۔

۱۱ نومبر ۱۹۶۶

جاسوسی ناولیں پڑھنے اور سنیما دیکھنے کے فائدوں کا اندازہ مجھے آج اُس وقت ہوا جب یونی ورسٹی کے دو طالب علموں نے دس منٹ کے اندر دو بسیں جلادیں اور بس اسٹینڈ کو آگ لگادی۔ پڑھنے لکھنے کا مقصد آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا! اس سے زیادہ سے زیادہ ملازمت ہی تو مِل جاتی ہے پارلیمنٹ کی ممبری اور وزارت تو نہیں ملتی۔ ممبری اور وزارت تو ہڑتالیں کرانے، جلوس نکلوانے اور توڑ پھوڑ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر ہم کو پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے؟ آج پارلیمنٹ کے ممبروں اور وزیروں میں کتنے پڑھے لکھے ہیں؟ کتنے ایم اے اور بی اے پاس ہیں؟ صرف گنتی کے چند۔ باقی سب جیل کے راستے سے کُرسی وزارت تک پہنچے ہیں۔ پھر ہم بھی اپنے رہنماؤں کے بتائے ہوئے راستہ پر کیوں نہ چلیں؟

۱۲ نومبر ۱۹۶۶

مجھے وہ دن دل سے پسند ہے جس دن شہر میں ہنگامے کی وجہ سے چُھٹی ہو جاتی ہے۔ سب لوگ سرکار کو بُرا کہتے ہیں، مگر میرے نزدیک تو وہی سرکار سرکار کہلانے کی حق دار ہے جو اسکولوں میں زیادہ سے زیادہ چھٹی دلائے۔ اچھا ہوا ہندوستان سے انگریز چلا گیا۔ بھلا اس کے یہاں کب طلبار کو ایسی چھوٹ دی گئی تھی کہ اسکول اور کالج کئی کئی مہینے بند رہیں؟ میں ۱۸ نومبر کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں، اس روز ملک بھر کے طلبار ایجی ٹیشن کرنے والے ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ انشاء اللہ لمبی چھٹی ہو گی۔ مجھے ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ یوپی کی حکومت پسند ہے جو اپنے یہاں مہینوں کالج اور اسکول بند کرانے کے گوشے نکالتی رہتی ہے اور بعض بعض اداروں کو غیر معینہ مدت تک بھی بند رکھنے کا اعلان کرتی رہتی ہے۔ کس قدر خوش نصیب ہیں یوپی کے طلبار جو پڑھتے کم اور پاس زیادہ ہوتے ہیں، اور چھٹیاں بھی دنیا میں سب سے زیادہ پاتے ہیں! خدا کرے ہندوستان یوپی بن جائے اور آئندہ انتخابات میں بھی پھر یہی پارٹی واپس آئے۔ ■■

ملاقات

اظہر افسر

کام کرنے والے

حامد
منوہر } دو ہم عمر لڑکے
راتے
منیجر
نوکر

شہر سے کسی دیہات کی جانب جانے والی بس کے اسٹینڈ پر حامد اور منوہر کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ حامد کے پیروں کے پاس ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس رکھا ہے۔

منوہر : تو سردی کی یہ ساری چھٹیاں تم اپنے چچا ابّا کے پاس گزارو گے؟

حامد : ہاں مگر اسکول کھلنے سے ایک دن پہلے شہر آجاؤں گا۔

منوہر : کتنی دُور ہے بودھن یہاں سے؟

حامد : سولہ میل ہے، دس بج رہے ہیں مگر اب تک بس کا پتہ نہیں ہے۔

منوہر : آتی ہی ہوگی، لو وہ آگئی۔

(ایک سُرخ سی بس قریب آکر رُک جاتی ہے)

حامد : اچھا بھئی چل دیئے منوہر۔ خدا حافظ۔ (حامد اٹیچی کیس لئے بس کے اندر چلا جاتا ہے۔)

منوہر : خدا حافظ۔

(بس چل پڑتی ہے ۔)

رائے : کہاں تک جارہے ہو؟

حامد : جی بودھن تک ۔

رائے : بودھن ؟ کس کے پاس ؟

حامد : انسپکٹر عبدالجبار صاحب کے ہاں ۔ وہ میرے چچا ہیں ۔

رائے : اچھا انسپکٹر عبدالجبّار تمہارے چچا ہیں ؟

حامد : جی ہاں ۔

رائے : وہ تو ہمارے پڑوسی ہیں ۔ نئی آبادی میں ہمارے گھر سے ملا ہوا، پلے گراؤنڈ ہے، سامنے تھانہ ہے اور وہیں تمہارے چچا کا گھر ہے ۔

حامد : بس کے اڈّے سے چچا ابا کا گھر کتنی دُور ہے ؟

رائے : بس تو تھانے کے سامنے ہی رُکتی ہے — کیوں پہلی بار جارہے ہو کیا ؟

حامد : جی ہاں، بڑے دنوں سے چچا ابا بلارہے تھے، اب چھٹیاں ہوئیں تو میں نے سوچا یہ چھٹیاں ۔ ۔ ۔ ۔

رائے : بودھن میں گزاری جائیں ۔

حامد : (ہنستا ہے) جی ہاں ۔

رائے : کون سے درجے میں پڑھتے ہو ؟

حامد : جی ساتویں کلاس کا امتحان دیا ہے ۔ کام یاب ہوجاؤں تو آٹھویں میں جاؤں گا ۔

رائے : بہت خوب ۔ یہ لڑکا کون تھا جسے تم نے خدا حافظ کہا ۔ بھائی ہے ؟

حامد : جی نہیں، میرا دوست ہے ، ہم جماعت ہے ۔ بڑا مصیبت زدہ ہے بے چارہ ۔

رائے : اچھا !

حامد : جی ہاں ، اپنے باپ کو تو اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد دیکھا ہی نہیں ۔ بے چاری ایک ماں تھی ، پاس کے گاؤں بانس واڑے میں ، دو مہینے ہوتے ہیں وہ بھی مر گئی ۔

رائے : چچ چچ چچ ۔

حامد : بڑا ذہین لڑکا ہے ۔ ہمیشہ درجے میں اوّل آیا کرتا تھا مگر اب وہ آگے نہیں پڑھ سکتا ۔

رائے : کیوں ؟

حامد : کیوں کیا ؟ پڑھائی کا سارا خرچہ سلائی کرکے ماں ہی گاؤں سے بھیجتی تھی ۔ یہ یہاں ہاسٹل میں رہتا تھا ۔ اب کون خرچہ اٹھائے ؟ یہ دو مہینے تو اسکول کے ٹیچروں نے چندہ کرکے کٹا دیئے ۔

رائے : پھر اب ۔ ۔ ۔ ۔ اب کیا کررہا ہے یہ ؟ کہاں ہے ؟

حامد : شہر میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی ہے، اس میں نوکری کی کوشش کررہا ہے ۔

رائے : تھیٹر میں ؟

حامد : جی ہاں، کہہ رہا تھا، منیجر نے کہا ہے، تین مہینے کام سیکھنا ہوگا اور وہیں رہنا ہوگا ۔

رائے : کل شام تم میرے گھر آسکتے ہو ؟ آج تو میں کسی کام سے بودھن سے آگے جارہا ہوں مگر کل شام کو گھر پر ہی رہوں گا ۔

حامد : آجاؤں گا ۔ آپ کا گھر تو چچا ابا کے گھر کے سامنے ہی ہے نا، جیسا آپ بتارہے ہیں ۔

رائے : ہاں ۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، تمہارے اس دوست کے بارے میں ، ہوں ؟

حامد : ضرور آجاؤں گا ۔

رائے صاحب کا سجا سجایا ایک خوبصورت کمرہ ۔ نوکر گلدان میں پھول سجا رہا ہے

دائیں جانب حامد نظر آتا ہے۔)

نوکر : کِس سے ملنا ہے بابا؟

حامد : رائے صاحب نہیں ہیں گھر پر؟

نوکر : ہاں ہیں۔

حامد : رائے صاحب سے کہو، وہ لڑکا آپ سے ملنے آیا ہے جس سے کل آپ کی ملاقات بس میں ہوئی تھی۔

رائے : (اندر سے) کون ہے گوپال۔

گوپال : (بائیں جانب جاکر) جی کوئی لڑکا آپ سے ملنے آیا ہے۔

رائے : (اندر ہی سے) اوہ - ہاں ہاں (بائیں جانب نمودار ہوتے ہیں۔)

حامد : آداب عرض ہے۔

رائے : جیتے رہو، جیتے رہو۔ آؤ آؤ۔ بیٹھو۔ (خود ایک صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں اور حامد کو پاس کے صوفے پر بٹھاتے ہیں۔) کہو لودھن پسند آیا؟

حامد : جی ہاں بہت، بہت اچھا گاؤں ہے۔

رائے : شکر فیکٹری بھی دیکھی۔

حامد : جی ہاں، بڑی تفصیل سے۔

رائے : اپنے سنتروں کے باغ بھی گئے تھے؟

حامد : جی نہیں، چچا ابا کہہ رہے تھے کل سب مِل کر جائیں گے۔

رائے : اچھا اچھا ___ گوپال کافی لاؤ بھئی۔

حامد : جی نہیں، میں کافی نہیں پیتا۔

رائے : واہ کیسے نہیں؟ میں بھی تو پی رہا ہوں۔ (نوکر چلا جاتا ہے) ہاں تمہارے اس دوست کا نام کیا ہے۔

حامد : جی منوہر۔

بس اب سیدھے ہاتھ سے بیگ میرے حوالے کردو

رائے : کیا منوہر تھیٹر کی نوکری چھوڑ کر پھر سے پڑھنا پسند کرے گا۔

حامد : واہ واہ، اس سے اچھی کون سی بات ہوگی! اس نے تو ہر طرف سے مایوس ہو کر تھیٹر کا رُخ کیا ہے۔

رائے : اگر میں ___ میں ہر مہینے اس کی پڑھائی کا خرچ بھیج دیا کروں؟

حامد : آپ اس کی پڑھائی کا خرچ بھیج دیں گے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا رائے صاحب، وہ اپنی پڑھائی کے چھوٹ جانے سے بڑا دُکھی ہے۔

رائے : میں ہر مہینے تیس روپے اسے بھیج دیا کروں گا۔ کافی ہو جائیں گے؟

حامد : جی ہاں کافی ہو جائیں گے۔ بیس روپے وہ ہاسٹل کو دے دے گا۔ دس روپے اس کی کتابوں اور دوسرے خرچوں کے لئے بہت ہیں۔ میں آج ہی اسے یہ خوش خبری لکھ بھیجتا ہوں۔ جب وہ میرا خط پڑھے گا تو پھولوں نہیں سمائے گا۔

رائے : تو ایسا کرو اپنا یہ پہلا خط اسے رجسٹری سے بھیج دو، اس میں دس روپے بھی رکھ دینا، بعد

میں، ہیں منی آرڈر سے بھیج دیا کروں گا۔ (رائے صاحب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں) گوپال میری کنجیاں کہاں ہیں؟

گوپال : یہاں ہیں سرکار البم کے نیچے۔ (وسط میں رکھی ہوئی میز پر سے کنجیاں اٹھا کر دیتا ہے۔)

رائے : لو تم اتنے البم دیکھو، میں ابھی آیا۔ (رائے صاحب بائیں جانب چلے جاتے ہیں)

حامد : (البم کے اوراق اِدھر اُدھر سے اُلٹتا ہے)۔ ارے یہ ــــ یہ تصویر ــــ یہ تو ــــ

رائے : (بائیں جانب سے آتے ہوئے) لو بھئی یہ روپے تم منوہر کو اپنے خط کے ساتھ بھیج دو۔

حامد : (روپے لے لیتا ہے)۔ رائے صاحب آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔

رائے : کون سی بات؟

حامد : (البم کی ایک تصویر دکھا کر) یہ تصویر کس کی ہے رائے صاحب؟

رائے : ــــ یہ میرے چھوٹے بھائی کی تصویر ہے۔

حامد : آپ کے چھوٹے بھائی کی تصویر ہے! پھر اب کہاں ہیں یہ؟

رائے : کوئی پندرہ سولہ سال ہوتے ہیں، یہ پتا جی کے زمانے میں روٹھ کر چلا گیا تھا کہیں۔ میں نے پتا جی کے مرنے کے بعد بھی اسے بہت تلاش کیا مگر کوئی پتہ نہیں ملا۔ اب بھی جب کبھی وہ دن یاد آتے ہیں جب ہم ایک ساتھ احمد آباد میں رہا کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرا چھوٹا بھائی کہیں گم نہیں ہوا ہے، یہیں کہیں ہے اور ابھی آ جائے گا ــــ مگر تم کیوں پوچھتے ہو؟

حامد : بالکل ایسی ہی تصویر میں نے منوہر کے ہاں دیکھی ہے، کیوں کہ یہ منوہر کے پتا کی تصویر ہے

رائے : منوہر کے پتا کی؟ کیا کہتے ہو؟

حامد : جی ہاں یہ منوہر کے باپ کی تصویر ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔

رائے : تو منوہر ــــ منوہر میرے چھوٹے بھائی کا لڑکا ہے؟ اور وہ یوں مارا مارا پھر رہا ہے! گوپال ــــ گوپال میرے کپڑے لاؤ۔ میں اسی وقت شہر جاؤں گا ــــ حامد۔

حامد : جی

رائے : تم میرے ساتھ چلو۔ ابھی اسی وقت۔

حامد : مگر رائے صاحب اس وقت تو کوئی بس نہیں ملتی۔ آپ کی گاڑی بھی خراب ہے۔

رائے : کوئی حرج نہیں کسی سے موٹر مانگ لیں گے۔ آؤ ــــ چلو ــــ جلدی کرو۔

(ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک میز اور کچھ کرسیاں ہیں۔ درمیانی کرسی پر ایک بڑی بڑی مونچھوں والا شخص بیٹھا ہے۔ سامنے منوہر بیٹھا ہے۔ ایک طرف تختی لگی ہے: مُون تھیٹریکل کمپنی ــــ دفتر دائیں جانب سے رائے صاحب اور حامد داخل ہوتے ہیں۔)

رائے : مُون تھیٹریکل کمپنی کے منیجر آپ ہی ہیں۔

منیجر : جی ہاں۔ آداب عرض ہے۔ تشریف لائیے۔

منوہر : ارے حامد ــــ تم؟

حامد : ہاں، یہ رائے صاحب ہیں، انہیں تم سے کچھ ضروری کام ہے۔ (منوہر سلام کرتا ہے۔)

رائے : (جیب سے ایک تصویر نکالتا ہے) اس تصویر کو پہچانتے ہو؟

منوہر : جی ـــ یہ ـــ یہ تصویر تو میرے پتا جی کی ہے آپ کے پاس کیسے آ گئی ؟

رائے : اپنے دادا کا نام جانتے ہو؟

منوہر : جی ہاں ـــ ماں کہتی تھیں، ان کا نام رائے کنول چند تھا۔

رائے : میرے بچے! میرے بھتیجے! تم میرے چھوٹے بھائی کی نشانی ہو۔ چلو میرے ساتھ۔

منیجر : صاحب آپ اس لڑکے کو کیسے لے جا سکتے ہیں۔

رائے : کیوں؟

منیجر : اس لڑکے نے اپنی ایکٹنگ کے کل وہ جوہر دکھائے ہیں کہ میں اسے سو روپے ماہوار دینے کو تیار ہوں۔

رائے : منیجر صاحب۔ یہ اب آپ کا نوکر نہیں ہے، یہ رائے کنول چند کا پوتا اور رائے گلاب چند کا بھتیجا ہے۔ آپ جتنے روپے چاہتے ہیں، مجھ سے لے لیجئے۔ ویسے اگر آپ کہیں تو میں اپنے بھتیجے کو آپ کے پاس کبھی کبھی بھیج دیا کروں گا ـــ شوقیہ اپنی ایکٹنگ کے جوہر دکھانے کو (ہنستے ہیں۔)

منیجر : آ ـــ آپ بھیج دیا کریں گے؟

رائے : ہاں ہاں، کیوں نہیں؟ ضرور۔ آؤ منوہر ـــ آؤ حامد۔

منیجر : بہت بہت شکریہ، (منیجر اٹھ کر رائے صاحب کو سلام کرتا ہے) آداب عرض ہے، آداب عرض ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

●●

انور اشفاق

ہمارا کلب

" شمی کی تھیلی کا رنگ کیسا ہے "

" شاید سبز ہے " جمی کا سرتیا نے جواب دیا۔

" سبز نہیں ہے " ریکھا نے ٹوکا

" سرخ ہوگا " نینا نے کہا

" نہیں بھئی سرخ نہیں بلکہ گلابی رنگ ہے۔" رتما نے اپنی رائے دی۔

ارے ہم سب رنگ کے جھگڑے میں کیوں پڑیں۔ کل ہم میں نے کوئی بھی شمی کے ساتھ بازار میں چلا جائے اور اس کی تھیلی پہچان لے۔" جمی نے سب کو مشورہ دیا۔

ایل آئی سی کوارٹرس میں رہنے والی لڑکیوں نے مل جل کر ایک انجمن "گرلس کلب" بنایا تھا۔ یہاں کی تمام لڑکیاں اس کی ممبر تھیں اور سب کی رائے سے جمی کو صدر، ریکھا کو نائب صدر، سرتیا کو جنرل سکریٹری اور مالا رما کو جوائنٹ سکریٹریز بنایا گیا۔ خزانچی کا عہدہ بہت اہم تھا اس لئے سب نے مل کر اپنی عمر سے بڑی سونیا ٹیگور کو خازن بنایا۔

گرلس کلب میں تقریباً سبھی لڑکیاں ممبر تھیں اور سب میں اتحاد و اتفاق قائم تھا۔ سب کی رائے سے پک نک منائی جاتی۔ تفریح کا پروگرام بنتا۔ شرارتوں کی اسکیم بنتی۔ غرض ہر کام سب کی مرضی سے ہوتا۔ امتحان کے دنوں میں سب ساتھا کروز باغیچہ میں مل کر پڑھائی کرتی تھیں اور ایک دوسرے کی مدد بھی کرتیں۔

کوارٹرس میں رہنے والے "گرلس کلب" کے قیام سے بہت خوش تھے اس لئے کہ اس کے ممبروں نے تعمیری کام بھی کئے۔ سب نے مٹرک کو ہموار کیا۔ باغیچہ کو حسین بنایا۔ ان پڑھ خواتین کو تعلیم دینے کے لئے فری کلاس کھولی، لیکن اگر کوئی اس کلب سے ناخوش تھا تو وہ شمی تھی۔ امیر ہونے کی وجہ سے اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ وہ اس کلب کی ممبر اس لئے نہیں بنی کہ سب لڑکیوں نے اس سے ممبر بننے کی درخواست کیوں نہیں کی۔ اس کو

خازن کیوں نہیں بنایا گیا۔ شمی کلب کے قیام کے خلاف تھی وہ اکثر کلب کے ممبروں کے خلاف قصیدے پڑھا کرتی تھی۔ اس لئے آج سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ شمی سے لڑنے کے بجائے اسے منایا جائے۔

اس کی ایک خاص عادت تھی کہ وہ گھر کے لئے سودا سلف خود لاتی تھی اس لئے کہ اسے اپنے نوکروں پر اعتماد نہیں تھا۔ باقی تمام کام کے لئے حکم چلاتی تھی۔ اس لئے آج سب لڑکیوں نے مل کر طے کیا کہ شمی سے بدلہ لیا جائے۔ صرف شمی کو یہ بتلا دیا جائے کہ اتحاد و اتفاق نہ رہنے سے کس قدر نقصان ہوتا ہے۔

جمی۔ سریتا۔ ریکھا۔ نینا۔ رما۔ مالا۔ نیرونزہ۔ فریدہ۔ نجمہ۔ جبیں۔ نفیسہ۔ خیری۔ زرینہ۔ رخسانہ۔ شبانہ۔ بینا۔ سکینہ۔ ریحانہ شکیلہ۔ سبھی لڑکیوں نے مل کر ایک اسکیم بنالی۔

جمی کو ہدایت دی گئی کہ وہ شمی کا رنگ کا رنگ پہچانے۔ پھر دوسرے دن اتوار کو سب کی سوچی ہوئی شرارت پر عمل کیا جائے گا۔

شام ڈھل گئی، میٹنگ ختم ہوگئی۔ سب اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔

جمی نے شمی کی تھیلی کا رنگ نہ صرف پہچان لیا بلکہ ویسی تھیلی بھی خرید لی۔ جمی کی ذہانت پر "گرلس کلب" کی ہر ممبر خوش ہوگی اور سب نے دوسرے دن مل جل کر بازار جانے کا پروگرام بنالیا۔

شمی کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آج کوارٹرس کی سبھی لڑکیاں بازار میں نظر آرہی ہیں۔ کوئی ترکاری خرید رہی ہے۔ کوئی انڈے کوئی گوشت۔ کوئی مچھلی۔ کوئی مسالے خریدنے میں مصروف تھی۔

جمی، سریتا، مالا، شمی کے قریب تھیں۔ سب نے شمی کی تعریف کر کے اس کو خوش کر دیا کہ آج شمی کی مرضی سے چیزیں خریدی جائیں گی شمی کا سینہ فخر سے پھیل گیا اور سر بلند ہوگیا۔

سامان خرید لیا گیا۔ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف چلنے لگیں۔ شمی بھی فخر سے قدم اٹھاتی ہوئی چلنے لگی۔ وہ بہت خوش تھی کہ گرلس کلب میں پھوٹ پڑ رہی ہے۔ اس کی صدر، جنرل سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری شمی کی سہیلیاں بن گئی ہیں۔ اب گرلس کلب ضرور ختم ہو جائے گا اس لئے کہ سرگرم اراکین نہ رہیں گی تو کلب کیسے چلے گا۔

شمی بہت خوش تھی۔ اس کی ایک ایک رگ خوشی سے پھڑک رہی تھی۔ لیکن جب اس نے تھیلی باورچی خانے میں اپنے نوکروں کو دی تو اس کی ساری خوشی ختم ہوگئی۔

اسے یاد آگیا جمی نے اس سے گلے مل کر اس کی تھیلی بدل وادی۔ اب اس تھیلی میں کنکر اور ریت بھری ہے۔

نوکر کہہ رہے ہیں کہ آج بائی جی! بازار لینے کے بجائے سمندر کے ساحل پر چلی گئی تھیں۔ شمی کو بے حد غصہ آیا۔ وہ پیر پٹکتے ہوئے سونیتا جی کے پاس گئی۔ اس نے خوب خوب شکایت کی۔ سونیتا جی لڑکیوں سے عمر میں بڑی تھیں۔ شمی کو پتہ تھا کہ گرلس کلب کی ہر ممبر سونیتا جی کی بات مانتی ہے، حکم سنتی ہے۔ یہاں تک کہ سونیتا کی ہر ڈانٹ کو برداشت کرتی ہے۔

شمی سوچ رہی تھی کہ سونیتا جی سب کی خبر لیں گی، لیکن سونیتا جی نے شمی سے یہی کہا گرلس کلب میں اس کلب اتحاد و اتفاق ہے کہ میں ان سے دشمنی مول نہیں لے سکتی۔ اب اگر ان سب نے شرارت کی ہے تو تمہارا فرض کیا ہے کہ تم اس کلب کی ممبر بن کر ان کے ساتھ رہ کر ان سب کو سمجھاؤ کہ شرارت کرنے سے کبھی کسی کی عزت بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ سونیتا جی نے شمی کو بہت سمجھایا۔

شمی خاموش رہی تو سونیتا جی نے پھر کہا آج انہوں نے بازار کی تھیلی بدل وادی کل نہ معلوم کون سی شرارت کریں اس لئے کہ یہاں کی سب لڑکیاں اس کلب کی ممبر ہیں اور صرف تم ہی نہیں ہو۔ یہ غلط بات ہے۔ تم کو بھی ممبر بننا چاہیئے اور سب کے ساتھ مل کر نہ صرف یہاں بلکہ ہر ترقی کے کام میں حصہ لینا چاہیئے۔

سونیتا جی خاموش ہوگئیں۔ شمی نے فوراً فیس ادا کر دی اور ممبر بن کر سب میں شامل ہوگئیں۔

●●

تصور میرا نہیں ہے۔
اس موٹر کی ایک اور صفت ہے کبھی انجن خراب ہو جا
تو آپ اس سائیکل پر اپنے گھر واپس جا سکتے ہیں
لطف یہ کہ موٹر میں سائیکل کے دام شامل نہیں ہیں

گھوڑا چچا

احمد جمال پاشا

گھوڑا چچا فریال کی سال گرہ میں سب سے آگے آگے اُچھلتے کُودتے نظر آرہے تھے۔ روبینہ نے مجھے سب سے پہلے بتایا، "یہ ہیں ہمارے گھوڑا چچا۔"

انہیں دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا کہ ان کا یہ نام کیوں رکھا گیا۔ نہ ان کا گھوڑا جیسا موہنہ یا لمبے لمبے کان تھے اور نہ دُم تھی۔ پھر روفی نے بتایا، "یہ خود گھوڑا نہیں ہیں، مگر ان کے اندر ایک گھوڑا چُھپا ہوا ہے۔"

میں نے پھر بہت غور سے انہیں دیکھا۔ ان کی ٹائی پن پر ایک گھوڑا بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سی مٹھائی، ٹافیاں چاکلیٹ، لائم جُوس اور نہ جانے کیا کیا چیزیں ایک باسکٹ میں لائے تھے۔ بچے انہیں بُری طرح گھیرے ہوئے تھے۔ ذرا سی دیر میں ان کی لائی ہوئی مٹھائیاں سب کی جیبوں اور موہنہ میں پہنچ گئیں۔ اور صوفیہ ان کے کندھوں پر چڑھ کر ان سے ضد کرنے لگی۔ "گھوڑا چچا چار ہاتھ پاؤں سے دوڑیئے!"

اور وہ سچ مچ چار ہاتھ پاؤں سے چلنے نہیں بلکہ دوڑنے لگے اور اس کے ساتھ زبردست شور مچلنے لگا۔

"گھوڑا چچا ہمیں بٹھایئے!"

"گھوڑا چچا ہمیں بٹھایئے!"

"گھوڑا چچا ہمیں بٹھایئے!"

بچے چاروں طرف سے انہیں بُری طرح گھیرے ہوئے تھے۔

مجھے کئی بار خیال آیا کہ یہ بابا لوگ شاید ان کی جان لے کر

مرنے کی تمنا بھی، جینے کا ارادہ بھی

چھوڑیں گے۔ میں نے بچوں کو ڈانٹا مگر گھوڑا چچا نے بچوں کو ڈانٹنے پر مجھے بہت بری طرح گھور کر دیکھا۔ میں سہم کر رہ گیا۔ اس کے بعد مجھے چمکارتے ہوئے انہوں نے جیب سے ٹافیاں نکال کر دیں اور بولے، "بری بات! بابا لوگوں کو ڈانٹتے نہیں۔ جاؤ کھیلو!" پھر وہ گھوڑا بن کر بچوں سے کھیلنے لگے۔ اور مجھے ہنسی آگئی۔

مگر میں نے دیکھا کہ بچے بالکل ان کے اشارے پر چل رہے تھے۔ جب وہ کہتے "شور کرو"، تو اتنے زور کا غل غپاڑہ مچتا کہ معلوم ہوتا کوٹھی پر بندروں نے حملہ کر دیا ہے۔ اور جب وہ اشارہ کرتے کہ "خاموش"! تو ایک دم سناٹا چھا جاتا۔ بس معلوم ہوتا کہ یہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ سال گرہ کا کیک کٹنے سے پہلے میلاد شریف ہوا۔ چچا نے میلاد پڑھا۔ وہ سب سے آگے تھے۔ مگر کیا مجال جو کسی بچے کی آواز بھی سنائی دی ہو۔ اور پھر جب سلام پڑھا گیا تو سب سے نمایاں آواز بھی گھوڑا چچا ہی کی تھی۔ اور جب "ہے پی برتھ ڈے ٹو یو" کا کورس شروع ہوا تو معلوم ہوتا تھا کہ "چچا" نہیں کسی بوڑھے انگریز کی روح بول رہی ہے۔ پھر کیک کٹنے پر جب انہوں نے تالی بجائی تو بچوں نے بہت زور زور تالیاں بجائیں۔ بس بچے تھے کہ قدم قدم پر ان کے اشارے پر چل رہے تھے۔ جب گھوڑا چچا کہتے، "بھئی اب کہانی سنائی جائے" تو سب بچے لحاف میں گھس کر خاموشی سے سننے لگتے اور وہ مزے لے لے کر نانی اماں کی طرح کہانی پر کہانی سناتے چلے جاتے۔

میری ان سے پہلی ملاقات ہی میں بڑی گہری دوستی ہو گئی اور انہوں نے اگلے دن مجھے چائے پر بلا لیا۔
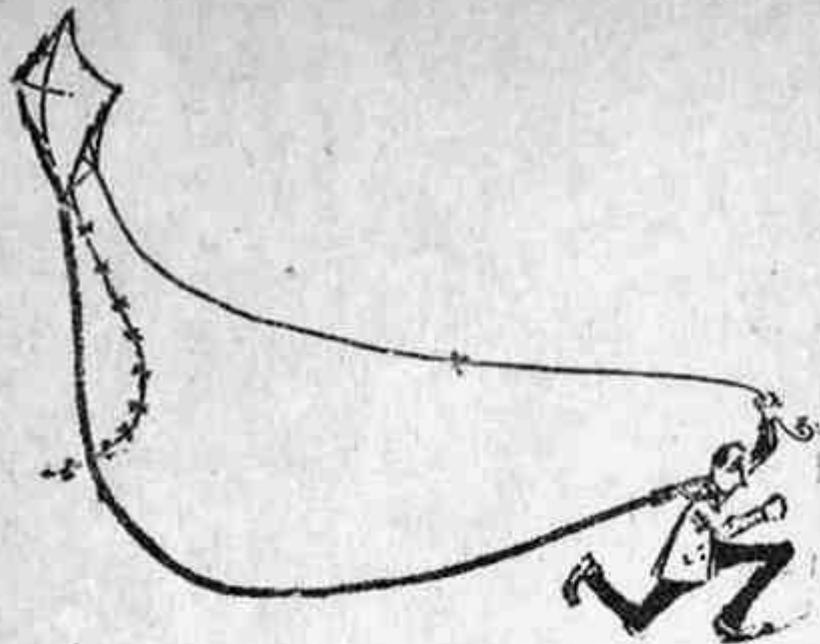
چائے پر گھوڑا چچا ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی ناشتے میں ہمارا ساتھ دے رہی تھیں۔

اچانک میرے مونہہ سے کہیں نکل گیا، "گھوڑا چچا!"

اور وہ ایک دم بگڑ گئے، "کیا مطلب؟ کیا مطلب؟"

میں گھبرا گیا۔ ان کی بیگم صاحبہ نے پوچھا، "کون؟ گھوڑا چچا کون؟"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ انہوں نے چپکے سے میرا پاؤں دبا دیا اور میں خاموش ہو گیا۔

مگر مسز گھوڑا سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے پھر پوچھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا، "انہیں بچے بہت پسند ہیں۔"

وہ ایک دم سے اداس ہو گئیں اور بولیں، "ہاں بچے ہم دونوں ہی کی کمزوری ہیں۔"

اس کے بعد دونوں اداس اور خاموش ہو گئے۔ ہم نے بغیر کچھ اور کھائے میز چھوڑ دی۔

تھوڑی دیر بعد میں چلا آیا۔

گھوڑا چچا سے اب بھی ملاقات ہوتی ہے، لیکن اب میں خیال رکھتا ہوں کہ ذرا بھی کسی تقریب میں بچے جمع ہو جائیں تو ان کو فوراً بلوا لیتا ہوں اور ان کے ساتھ پھر ہم سب کا دل بہل جاتا ہے۔ ●●

عمر عادل (مارہروی)

کامریڈ چنّو سے انٹرویو

کامریڈ چنو محلے اور اسکول کے بچوں کے لیڈر تھے۔ انہوں نے محلے میں بچوں کا کلب بھی قایم کیا تھا اور اس کلب کے ممبروں نے ہی انہیں اپنا لیڈر چنا تھا۔ وہ تھے بھی واقعی لیڈر۔ ہر بات میں آگے آگے رہتے۔ کوئی بچہ کسی باغ میں پھل توڑتے ہوئے، اسکول سے بھاگتے یا اسکول کا کام نہ کرنے پر یا امتحان میں نقل کرتے ہوئے پکڑا جائے، کسی بچے کے پیسے یا کتابیں کھو جائیں یا کوئی بچہ خود ہی کھو جائے، غرض بچوں کا کوئی بھی کیس ہو، کامریڈ چنو مدد کے لئے سب سے آگے رہتے اور اسی لئے صرف بچے ہی نہیں، بڑے بھی انہیں کامریڈ چنو کہتے تھے۔ اور تیرہ سال کے کامریڈ چنو اس طرح بچوں کے لیڈر بن گئے تھے۔

ہم کئی دن سے چنو کا انٹرویو لینا چاہتے تھے، مگر ان کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا، ایک دن ان کے گھر گئے تو معلوم ہوا کہ آج ان کے کلب کا دوسرے محلے کے بچوں سے کرکیٹ کا پہلا ٹیسٹ میچ ہے اور وہ فیلڈ میں ملیں گے۔ فیلڈ میں پہنچے تو پتہ چلا کہ ٹیسٹ میچ واقعی تھا بلکہ شروع ہو گیا تھا اور کامریڈ چنو اپنی ٹیم کے پہلے کھلاڑی کی حیثیت سے کھیلنے بھی آئے تھے، مگر ہمیشہ کی طرح پہلی ہی بال پر ان کا وکیٹ اڑ گیا اور اس پر جھگڑا ہو گیا۔ اس لئے میچ ختم ہو گیا اور اب چنو میاں اپنی ٹیم کو لے کر آموں کے باغ میں گئے ہوئے تھے۔ پھر ایک دن چھٹی کے وقت ہم ان کے اسکول پہنچ گئے، مگر دیکھا یہ کہ جیسے ہی چھٹی ہوئی کامریڈ چنو ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے سامنے مرغا بنا دیے گئے۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ جب تک ہیڈ ماسٹر صاحب اسکول میں رہیں گے کامریڈ چنو مرغا بنے رہیں گے۔

آخر ایک روز کامریڈ چنو ہمیں مل ہی گئے۔ وہ اپنی پارٹی کے ساتھ فیلڈ میں بیٹھے گنّے کھا رہے تھے۔ ہم کو اپنی طرف آتا دیکھ کر

اندر آنے کا دروازہ پیچھے ہے جناب !

پہلے تو انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اس طرح ہاتھ پاؤں سمیٹے جیسے خطرہ محسوس کر کے بھاگنے والے ہوں مگر جب ہم نے مسکرا کر اور ہاتھ ہلا کر انہیں سلام کیا تو وہ مطمئن ہو گئے۔ قریب پہنچ کر ہم بے تکلفی سے ان کے برابر میں بیٹھ گئے۔ چنّو نے ہمیں ایک گنّا پیش کیا اور ہم نے گنّا چھیلتے ہوئے اپنا کام شروع کیا۔

ہم — کامریڈ چنّو ہم آپ سے انٹرویو لینا چاہتے ہیں —

کامریڈ چنّو — کوئی حرج نہیں۔ ضرور۔ آخر سب لیڈروں کا انٹرویو لیا جاتا ہے تو ہم سے کیوں نہ لیا جائے؟ نکالئے کاغذ قلم۔

ہم — اچھا تو یہ بتائیے کہ آپ بچوں کے لیڈر کیسے بنے؟

کامریڈ چنّو — اجی صاحب بنے نہیں بلکہ بنائے گئے ہیں۔ اگر یہ سب مجھے اپنا لیڈر نہ بناتے تو پھر کلب کا ممبر انہیں کون بناتا؟

ہم — آپ کے کلب میں کیا ہوتا ہے؟

کامریڈ چنّو — جی کرکٹ ہوتی ہے۔

ہم — سنا ہے آپ پہلے پہلے کھیلنے کو آتے ہیں اور پہلی بال پر ہی آؤٹ ہو جاتے ہیں۔

کامریڈ چنّو — پہلی گیند پر نہیں بلکہ اس پہلی گیند پر جو سیدھی وکیٹ پر آئے۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں کھیلنا نہیں جانتا، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ہر گیند کو پہلے میں دیکھتا ہوں کہ سیدھی ہے یا ٹیڑھی ٹیڑھی ہوتی ہے تو میں چھوتا بھی نہیں اور سیدھی ہوتی ہے تو کم بخت فوراً وکیٹ میں چلی جاتی ہے۔

ہم — سنا ہے آپ حساب کے گھنٹے میں ہمیشہ مرغا بنتے ہیں یا بنچ پر کھڑے کر دئے جاتے ہیں اور آپ کو یہ شکایت ہے کہ آپ کی خطا نہیں ہوتی۔

کامریڈ چنّو — خطا تو ہوتی ہے مگر غلطی میری نہیں ہوتی۔ قصہ یہ ہے کہ گھر کے لئے ماسٹر صاحب جو سوال دیتے ہیں وہ میں باجی سے نکلواتا ہوں اور وہ غلط نکل جاتے ہیں۔ مگر اب یہ بات نہیں، میں نے سوچا کہ باجی سے سوال نکلوا کر ایک تو ماسٹر صاحب کو دھوکا دیتا ہوں اور پھر باجی کا احسان بھی لیتا ہوں اور ان کا ہر کام کرنا پڑتا ہے اور پھر مار بھی پڑتی ہے۔ آخر تین تین گناہ کیوں ہوں؟ اس لئے اب میں سوال خود ہی نکالتا ہوں اور صرف مار پڑتی ہے نہ جھوٹ، نہ احسان، نہ خدمت اور نہ دھوکا — بس اب صرف مار رہ گئی ہے۔

ہم — اچھا یہ بتائیے کہ آپ کو باغ سے آم توڑ کر کھانے میں مزہ آتا ہے یا خرید کر کھانے میں۔

کامریڈ چنّو — آپ نے سنا ہوگا کہ محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے باغ سے آم توڑنے میں مالی کا ڈر، دوڑ بھاگ، اچھل کود۔ غرض بڑی محنت پڑتی ہے اور خریدے ہوئے آم میں کیا محنت؟ ابا نے پیسے دئے۔ ہم نے آم خریدے اور کھا لئے۔ بس اور کیا۔

ہم — معاف فرمائیے گا کامریڈ چنّو، سنا ہے آپ جھوٹ بھی بولتے ہیں۔

کامریڈ چنّو — بولتے نہیں تھے بولنا سکھایا گیا۔ ابا گھر میں ہیں اور کوئی ان سے ملنے آیا تو ہم سے کہلوا دیا کہ نہیں ہیں۔ بھائی صاحب جا رہے ہیں سنیما دیکھنے اور ہم سے کہہ دیا کہ ابا پوچھیں تو کہہ دینا

کہ کتابیں لے کر پڑھنے گئے ہیں۔ اب اگر بڑوں کی ایسی باتیں نہ مانی جائیں تو پھر آپ کو شکایت ہو کہ ہم بڑوں کا کہنا نہیں مانتے۔

ہم — ماشاءاللہ آپ بہت ذہین معلوم ہوتے ہیں اور ......

کامریڈ چنو — معلوم نہیں ہوتے بلکہ ہیں۔ کامریڈ چنو نے ہماری بات کاٹ کر کہا۔

ہم — ہمارا مطلب یہی تھا۔ اچھا تو یہ بتائیے کہ جب آپ پڑھ لکھ چکیں گے تو پھر کیا کریں گے؟ کیا بڑے ہو کر آپ بڑوں کے لیڈر بنیں گے؟

کامریڈ چنو — لیڈر تو بنوں گا مگر جناب فوج کا۔

ہم — یعنی آپ فوجی بنیں گے؟

کامریڈ چنو — بنوں گا کیا فوجی خود بنا دیں گے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میرا غلیل کا نشانہ کتنا سچا ہے! آج تک جناب میں نے باون کبوتر اور چڑیاں شکار کی ہیں۔ ایک سو تین آم اور امرود وغیرہ گرائے ہیں، چھ گھڑے، چار صراحیاں توڑی ہیں۔ تیرہ روشن دان کے شیشے اور پانچ برتن توڑے ہیں، اور دو لوٹوں میں سوراخ کیا ہے۔ ایک بچے کی ایک آنکھ بھی پھوڑی ہے۔ مگر آنکھ تو غلطی سے پھوٹ گئی تھی ورنہ میں تو اس کے سر پر رکھے ہوئے بیر پر نشانہ لگا رہا تھا۔ غلطی اس کی تھی کہ وہ ہل گیا۔

ہم — یہ سارے شکار تو آپ نے غلیل سے کئے ہیں۔ مگر فوج میں تو غلیل نہیں بلکہ ....

کامریڈ چنو — میں جانتا ہوں وہاں توپ اور بندوق ہوتی ہے لیکن آپ خود سوچئے، جس کا غلیل کا نشانہ اتنا اچھا ہو اس کا توپ اور بندوق کا نشانہ کتنا شاندار ہوگا! بس جناب دشمن کے ہوائی جہاز اور فوجی اس طرح گریں گے جیسے بارش کی بوندیں۔ اب تک میں نے بچوں کے لئے کام کیا ہے، بڑا ہو کر دیش کے لئے کروں گا!

ہم — بہت خوب! آپ کے خیالات بہت اچھے ہیں۔ خدا آپ کو کامیاب کرے۔ میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ بس آخر

زبان باہر نکال تو رکھی ہے، ڈاکٹر صاحب!

میں ایک بات اور بتا دیجئے۔ سنا ہے آپ شاعری بھی کرتے ہیں؟

کامریڈ چنو — کرتا ہوں تو صاحب کسی کا کیا بگڑتا ہے۔ جب ہر ایرا غیرا نتھو خیرا شعر کہتا ہے تو کامریڈ چنو کیوں نہ کہے؟

ہم — آپ شعر کس طرح کہتے ہیں۔

کامریڈ چنو — ایسے کہتا ہوں جیسے — جیسے دیکھئے میرا یہ شعر ہے۔ یہ میں نے چین سے جب جنگ ہو رہی تھی، تب کہا تھا۔ عرض کرتا ہوں:

چاؤ ماؤ مردہ باد
چاچا نہرو زندہ باد

ہم — بہت خوب — بہت خوب — اچھا اب اجازت دیجئے۔

کامریڈ چنو — مگر یہ بتائیے جناب، سب لیڈروں کے انٹرویو اخباروں میں چھپتے ہیں۔ آپ کامریڈ چنو کے اس انٹرویو کو کس رسالے یا اخبار میں چھپوائیں گے۔

ہم — یہ میں 'کھلونا' کو بھیج دوں گا — ہم نے کہا اور کامریڈ چنو اور ان کے ساتھیوں سے ہاتھ ملا کر واپس چلنے لگے۔ ●●

محمد قاسم صدیقی

ان داتا

اتر پردیش میں ایک چھوٹا سا قصبہ سولی ہے جہاں امتیاز نامی ایک زمین دار رہا کرتے تھے گاؤں کے ہندو مسلمان سب ان سے پیار کرتے تھے اور اسی پیار کے نتیجہ میں سب نے ان کا نام لالہ میاں رکھ دیا لالہ میاں ابھی چودہ سال کے تھے کہ ان کی شادی ہو گئی اور پھر ایک سال بعد اللہ نے انہیں ایک بیٹا دیا۔ قصبہ کے سب ہی لوگ دیکھنے آئے اور ایک جمگھٹا لگ گیا اس بچہ کا نام رفیع رکھا گیا۔ رفیع کے بعد اس کے ایک اور بھائی شفیع بھی ہوا۔

رفیع شروع ہی سے الگ تھلگ رہتا۔ وہ بہت ہی شرمیلا تھا۔ رفیع جب پانچ سال کا ہوا تو اسے مولوی صاحب کے پاس پڑھنے بٹھایا اور وہ فارسی پڑھنے لگا۔ اسی زمانہ میں لالہ میاں نے حاجی چھوٹک کو جو ایک اچھے پہلوان تھے رفیع کی تربیت پر مقرر کیا۔ حاجی چھوٹک بہت اصولی اور سخت آدمی تھے رفیع بھی اُن کے ساتھ رہ کر با اصول بنتا گیا۔ رفیع نے پہلوانی بھی شروع کر دی تھی۔ گاؤں میں دو کھیل پسند کئے جاتے تھے گلی ڈنڈا اور کبڈی۔ اور رفیع کو دونوں کھیلوں ہی سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ بڑے شوق سے کبڈی اور گلی ڈنڈا کھیلتا۔ وہ جس پارٹی کی طرف ہوتا وہ پارٹی ہمیشہ جیت جاتی۔

ابھی رفیع دس سال کا تھا کہ اس کے چچا ولایت علی اسے بارہ بنکی لے گئے اور وہاں ہائی اسکول میں داخل کر دیا۔ رفیع

شروع سے حساب میں تیز تھا۔ وہاں حساب ایک پنڈت جی پڑھاتے تھے وہ کلاس میں جاتے اور اونگ جاتے۔ وہ سوتے رہتے اور بچے ہنستے رہتے۔ پہلے امتحان کے بعد نتیجہ آیا تو رفیع کے نمبر سب سے زیادہ بس پھر کیا تھا پنڈت جی کلاس میں آتے رفیع کو بورڈ پر کھڑا کر دیتے اور خود سونا شروع کر دیتے۔ رفیع اپنے ساتھیوں کو سوال کرایا کرتا۔ لڑکے اسے پنڈت جی کہہ کر چھیڑا کرتے۔

ان کے باپ لالہ میاں بہت ہی ایمان دار تھے وہی بات رفیع کے اندر بھی تھی۔ اس زمانے کا ایک واقعہ ہے، رفیع ابھی چھوٹا ہی تھا۔ اس کے خاندان کے کچھ لوگوں میں مقدمہ بازی ہوئی اس میں خود رفیع کی جائداد کا مسئلہ بھی تھا۔ مخالف لوگوں نے لالہ میاں کی ایمان داری کی وجہ سے خود اپنی گواہی میں انہیں بلا لیا۔ سب جانتے تھے کہ لالہ میاں گواہی میں گئے تو مقدمہ ہار جائے گا سب نے ہی منع کیا لیکن رفیع نے کہا کہ انہیں جانا چاہئے اور سچی بات کہنی چاہئے۔ چنانچہ لالہ میاں گئے اور مقدمہ ہار گئے۔ رفیع کو بھی جائداد سے ہاتھ دھونا پڑا لیکن اس کی سچائی اور ایمان داری کی دھاک بیٹھ گئی۔

رفیع نے ہائی اسکول کے بعد علی گڑھ میں داخلہ لے لیا۔ یہاں منٹو سرکل کی یونین میں خوب خوب رنگ جمایا اس زمانہ میں وہاں کے پرنسپل ٹول تھے وہ انگریزوں کے پکّے دوست اور انقلابیوں کے سخت دشمن تھے۔ ایک مرتبہ یونین میں اس موضوع پر بحث ہوئی ”کوئی قوم کسی دوسری قوم کو عرصہ تک غلام نہیں رکھ سکتی“ رفیع کو موقع مل گیا اس نے فوراً اپنے ساتھیوں کو اکسایا اور انگریزوں کے خلاف پورا محاذ بنا لیا۔ پرنسپل نے سب کو باغی ٹھیرایا اور رفیع کو بلا کر تقریر کرنے والوں کے نام معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ اس نے ایک حقیقی اور سچّی بات پر بحث کی تھی۔ رفیع نے تمام دباؤ اور زیادتیاں برداشت کیں لیکن اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتائے۔

رفیع کے گھر سے بہت کافی روپیہ آتا تھا لیکن ہر مہینہ رفیع گھر سے روپیہ منگانے کے لئے خط لکھتے آخر ان کے گھر والے پریشان ہو گئے اور انہوں نے علی گڑھ آکر معلوم کیا تب اس کے دوستوں نے بتایا کہ گھر سے آیا ہوا تمام روپیہ دوستوں کی فیس اور کتابوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ جو بھی لڑکا آتا اور اپنی ضرورت بیان کرتا رفیع اس کی ضرورت دور کر دیتا اور کچھ دنوں بعد یہ ہوا کہ خود رفیع یہ معلوم کرتا کہ کن کن لڑکوں کی فیس نہیں گئی وہ جا کر ان لڑکوں کے حالات جاننے کی کوشش کرتا اور ان کی مدد کرتا۔ اس کی مدد کی یہ عادت تمام عمر رہی۔

رفیع میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ہر تکلیف کو تنہا برداشت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ رفیع کی آنکھیں دکھنے آئیں سخت تکلیف تھی وہ گھر کے کونہ میں چھپتا پھرتا کہ کوئی اس کی آہ نہ سن سکے خود ہی وہ ڈراپر لے کر دوا ڈالتا۔ آنکھوں کی یہ تکلیف جب بہت بڑھی تو یہ طے ہوا کہ دلی جا کر دکھایا جائے۔ رفیع نے تیس روپے جمع کئے اور جانے کو تیار ہوا اس کا ایک دوست بھی ساتھ ہو لیا۔ دونوں دلی کے کارونیشن ہوٹل میں ٹھیرے رفیع نے خوب خوب خرچ کرنا شروع کیا اس کا دوست مٹھائی کا شوقین تھا چنانچہ رفیع کی جیب میں امرتیوں کی تھیلیا رہتی اور وہ کھانے کے بعد اسے پیش کر دیتا۔ روپے سب ختم ہو گئے اب رفیع کا دوست پریشان ہوا کہ ہوٹل کا بل کیسے ادا کیا جائے گا۔ رفیع ہنستا اور مذاق اڑاتا لیکن دوست جھنجھلا جاتا۔ بات یہ تھی کہ رفیع نے سب حال بتا کر پہلے ہی ہوٹل کے منیجر سے طے کر لیا تھا کہ وہ علی گڑھ سے روپیہ بھیجے گا۔ اس وقت علی گڑھ کا نام ہی سچائی کی ضمانت تھا۔

رفیع زندگی بھر اصول پسند رہا۔ ان اصولوں کے معاملہ میں وہ کسی قسم کی سودے بازی کرنے کو تیار نہ تھا۔

رفیع ایک زمانہ میں ڈاک خانہ کے بڑے افسر ہو گئے۔

"بس اب کھیل چکے ـــــــ بہت دیر ہوگئی، میں جارہی ہوں"

ڈاک خانہ والوں کی شکایات آتی تھیں کہ وہ اچھا برتاؤ نہیں کرتے بس پھر کیا تھا رفیع نے بھیس بدلا اور جاکر لائن میں کھڑا ہوگیا۔ ڈاک خانہ والوں نے اس کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کیا اور آخر انہیں سزا دی وہ جگہ جگہ اسی طرح بھیس بدل کر گیا اس نے سب کو بتایا کہ تم عوام کے خادم ہو حاکم نہیں۔ اس طرح وہ جس نوکری پر رہا اسی طرح صحیح حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا اور لوگوں کے کام آتا۔

جب وہ نوکر ہوگیا اور اس کے پاس طاقت آئی تو اس نے کبھی اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ مدد کرنے کی عادت میں اور اضافہ ہوگیا۔ طلبا آتے اور پڑھنے کے لئے اس سے وظیفہ لے جاتے۔ بیوائیں مستقل امداد پاتیں۔ لوگ اپنی لڑکیوں کی شادیاں کرتے تو جہیز کے لئے رفیع یاد آجاتا اور وہ اس کے پاس جاتے اور ہنستے ہوئے سب کچھ لے کر واپس آتے۔

ایک زمانہ میں ہندوستان میں اناج کی اسی طرح مصیبت آئی ہوئی تھی جیسے آج ہے۔ بڑے بڑے بیوپاریوں نے اناج کی کوٹھیاں بھری تھیں۔ اناج بازار سے غائب ہوگیا۔ تین سیر کا گیہوں پھر ڈیڑھ سیر کا ہی رہ گیا۔ حکومت نے راشن کر دیا جتنا شور مچانے لگی لوگ پریشان ہوگئے آخرکار رفیع کو بلاکر یہ کام سپرد کیا گیا۔ رفیع نے راشن توڑ دیا اور تاجروں کو ایک ہفتہ کے اندر اندر اناج لانے کا حکم دیا بس پھر کیا تھا منڈیاں کی منڈیاں اناج سے بھر گئیں۔ اور تین سیر کی بجائے چار اور پانچ سیر کا گیہوں بکنے لگا۔ ہر طرف سے لوگ اُسے دعائیں دینے لگے جنتا کو چین کا سانس ملا اور اس دن سے بہت سے لوگ اسے اَن داتا کہنے لگے

بچّو یہ رفیع کون تھا؟ یہ رفیع ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر رفیع احمد قدوائی تھا جو صحیح معنی میں اس دھرتی کا سپوت تھا جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ عوام کی خدمت میں گزارا جس نے ملک کے آگے کسی چیز کو نہ سمجھا جس نے اپنے اصولوں کے لئے سب کچھ قربان کیا اور سودے بازی سے کام نہ لیا۔ جس کی کوششوں سے سیکڑوں طلبا پڑھ گئے ہزاروں بیواؤں کی پرورش ہوتی اور پچاسوں لڑکیوں کا سہاگ قائم ہوا۔ ہزاروں کو نوکریاں ملیں۔ وہ سچے لیڈر تھے قوم وملک کے لیڈر جو یک جہتی اور اتحاد کی زندہ مثال تھے۔ ہندو مسلم سکھ سبھی اُن سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ قوم بھی ان سے پیار کرتی تھی۔ اس پیار کا بھی ایک قصہ سُن لو۔ اُن کا جب انتقال ہوا تو معلوم ہے انہوں نے کتنا سرمایہ چھوڑا؟ ان کی دولت تھی ان پر ایک لاکھ سے اُوپر کا قرض۔ اس قرض کو ادا کرنے کانپور اور کلکتہ کے مل مالک آئے اور ان میں جھگڑا ہوا ایک کہتا تھا پورا قرض میں دوں گا اور دوسرے کا دعویٰ تھا کہ ان کا حق زیادہ ہے۔ آخر دونوں نے آدھا آدھا قرض دیا۔

یہ تھے رفیع احمد قدوائی۔ ہندوستان میں ان کا جواب پیدا ہونا مشکل ہے وہ مرے نہیں۔ زندہ ہیں ایسے لوگ مرا نہیں کرتے۔

■ ■

نتیجہ انعامی تصویر نمبر ۴

جنوری کے کھلونا میں ہم نے ایک بچّہ کی جو پانی کے ٹب میں بیٹھا ہوا تھا، تصویر شائع کی تھی۔ اس کا عنوان کھلونا بہن بھائیوں کو لکھنا تھا۔ ہزاروں جوابوں میں سے ہمیں مہ جبیں شورخ (کلکتہ ۱۴) کا عنوان "جل شہزادہ" بہت پسند آیا۔ انہیں دو روپے کی کتابیں انعام دی جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ عنوانات بھی پسند آئے :

بولتی نگاہیں (محمد علی، رانی گنج) کنول اور تالاب (محمد عثمان سبحانی، کلیان) اندھیرے کی روشنی (عبدالرشید بھٹ، سری نگر) ملک کا چراغ (محمد الیاس، آسنسول) کھلتا کنول (رضوان کاظمی، نئی دہلی) ماں مجھے ممتا دو (سفورد مومن، کروار) پانی کا کنول (سیّد قاسم رضا، رائے چور) اُبھرتا چاند (محمد شفیع، کلکتہ) ننھا تیراک (سیّد علی خوندمیری، حیدرآباد) ننھا تارہ (شاہین اعظم ربّانی، مدھوبنی)

نتیجہ انعامی کارٹون نمبر ۶

جنوری کے کھلونا میں انعامی کارٹون شائع ہوا تھا جس میں بھائی اسکول جاتے ہوئے اپنی بہن سے کچھ کہہ رہا تھا۔

اس کا سب سے دل چسپ جواب انصار احمد امیر الدین سلیمانی (سورت) نے بھیجا ہے :

"تمہیں معلوم ہے آج میں نے ناشتہ میں انڈا کیوں نہیں کھایا؟ مجھے معلوم ہے کہ حساب کے ماسٹر صاحب آج مجھے "انڈا" ضرور دیں گے۔"

اس کے علاوہ ہمیں یہ جواب بھی پسند آیا : قرۃ العین رنگلا (بمبئی)

"ارے منّی آج اسکول میں انڈا ملنے والا ہے اور میں پلیٹ لانا تو بھول ہی گیا۔"

انعامی کارٹون نمبر ۷

اوپر ایک کارٹون بنا ہوا ہے ——— مگر یہ کیا اس میں کچھ بات چیت تو دکھائی نہیں کہ یہ بچّہ لائبریری کے انچارج سے کیا کہہ رہا ہے؟

ہاں بھئی یہ انعامی کارٹون ہے اس میں بات چیت تم کو بھرنی ہوگی اور اس پر انعام بھی ملے گا؛ ذرا تھوڑی دیر سوچو کہ تمہارے خیال میں کیا بات چیت دی جانی چاہئے۔ سوچنے کے بعد ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ لو اور "انعامی کارٹون نمبر ۷" ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ نئی دہلی نمبر ا کے پتے پر بھیج دو۔

۱۸ فروری ۱۹۶۷ تک ملنے والے جو جواب سب سے زیادہ مزاحیہ اور دل چسپ ہوگا اس کے بھیجنے والے کو ۵ دل چسپ کتابیں انعام دی جائیں گی۔

ANNUAL KHILAUNA 19th Year of Publi[illegible]ion
Registered with the Registrer of Newspapers at R. N. No. 637/57
FEBRUARY 1967
Regd. No D-71